سرمست

(غزلیات)

سنہ ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۷ھ تک

(کیفی حیدرآبادی)

فہرست

(سرمست)

سہوِ کتابت

صفحہ	سطر	کیا لکھنا تھا	کیا لکھا گیا
۴	۱۰	مستور	مسطور
۵	۲۱	ہے	ہی
۹	۹	معنًا	معنا
۱۰	۱۴	ملیے	مینے
۱۰	۱۸	ہم سا	ہم سا
۱۰	۱۹	کنہ	کنمہ
۱۱	۶	وابستہٗ	وابستہ
۱۱	۲۱	ڈھونڈ لیں گے	دھونڈ لیں گے
۱۳	۶	تری	تری
۱۳	۷	بھی	بھی
۱۳	۹	سائے	سامے
۱۵	۷	تمھاری چشم	تمھاری چشم
۱۶	۱	ہوں	ہوسا
۱۶	۶	خوار	خار
۱۶	۱۷	ہنس کر	مینس کر
۱۷	۳	اِدھر عصیاں	اُدھر عصیاں
۱۷	۱۷	کب ہے	کب ہی
۱۸	۱۴	مجھی سے	مجھے سے
۲۳	۵	اِس قابل زباں	اُس قابل زباں
۲۳	۹	کروں گا	کروں کا
۲۳	۱۹	بآئین ہیں	بآئن ہیں
۲۴	۴	کھب گئی	کھپ گئی
۲۴	۷	چشم بد دور	چشم بدور
۲۴	۱۸	فرقت کی داستاں کے	فرقت کی داستاں کے
۲۸	۲۱	خود پسند	خود پرپسند
۲۹	۱۱	خنجر	جنجر
۲.۹	۱۱	آئینے	آمنے
۳۳	۱۵	چھتنے	جنتے
۳۶	۱	بیت الحزن	بیت الحزں
۳۶	۸	ساماں کی	ساماں کے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرمست

الف

۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۷ھ تک

خم، سبو۔ ساغر۔ صراحی۔ جام۔ پیمانہ مرا
میرے ساقی! جب مرا تو ہی تو میخانہ مرا

بے نیازانہ طبیعت دل ہی شاہانہ مرا
بھیس تو یوں دیکھنے کو ہی فقیرانہ مرا

ہر طرف مشق تصور سے ہی نقش یار کا
میرے حق میں جنت الماویٰ ہی کاشانہ مرا

تم یہاں کیا آئے گویا اک خدائی آگئی
آج تو اک محشرستاں ہی جلوخانہ مرا

ساز و ساماں ہیں مری یہ بے سر و سامانیاں
باغ جنت سے بھی اچھا ہی۔ یہ ویرانہ مرا

بعد مدت کے ہوی ہی قدر۔ اب کہتے ہیں وہ
"آج تک میرا ہی دیوانہ ہی۔ دیوانہ مرا"

دشمن اپنا آپ ہوں میں دوست اپنا آپ ہوں
کوئی دنیا میں یگانہ ہی نہ بیگانہ مرا

میں یہ کہتا ہوں "پرائی آگ میں گرتا ہی کون؟"
شمع کہتی ہی "مگر ایسا ہی پروانہ مرا"

درد دل میرا ہوا ہی باعث آرام یار
نیند آنے کے لیے سنتا ہی افسانہ مرا

ای خمار وصل! اب تو سر اٹھانے دے مجھے
ہو گیا ترکا، ہلاتا ہی کوئی شانہ مرا

شعر کیا۔ نعرہ بھی سن کر کہتے ہیں "کیفی ہی یہ"
چھپ نہیں سکتا کہیں انداز مستانہ مرا

(رسالہ اردوے معلیٰ علی گڑھ) (۱۹۰۵ء م ۱۳۲۳ھ)

درد خمار عشق مرے سر ہوا تو کیا
سودا جو ہو چکا ہو۔ وہی پھر ہوا تو کیا

وہ جوش دادخواہی بے داد ہی نہیں
ہنگامۂ روز حشر کا پھر ہوا تو کیا

اب، وہ غم فراق کی لذت کہاں نصیب؟
غمگین دل۔ اگر مری خاطر ہوا تو کیا

اب وہ دماغ ہی نہ رہا اے جنونِ عشق! سودا کسی کا لاکھ مرے سر ہوا تو کیا
اب چشم امتیاز کی منت، اٹھائے کون؟ پنہاں ہوا تو کیا، کوئی ظاہر ہوا تو کیا
اب دل میں۔ حسرتِ شبِ امید ہی نہیں ہر روز لاکھ بار دن آخر ہوا تو کیا
ہم ہیں وہی۔ مگر وہ طبیعت، وہ دل کہاں؟ نالوں سے کوئی اب متاثر ہوا تو کیا
سمجھائے کیا اسے جو نہ سمجھے کسی کی بات ناصح۔ اگر بڑا ہی مقرر ہوا تو کیا
محشر میں ہو رہی ہے قیامت؟ تو ہونے دو حاضر ہوا تو کیا میں نہ حاضر ہوا تو کیا
وہ صلح کل پسند طبیعت۔ نہیں رہی مومن ہوا تو کیا کوئی کافر ہوا تو کیا
ہم اپنے دردِ دل کی کہانی سنائیں گے جز بز ہوا تو کیا کوئی برہم ہوا تو کیا
کہتے ہیں شاعری جسے کیفی! وہ اور ہے
ہونے کو کوئی ناظم و ناثر ہوا تو کیا

صحیفہ جلد (۱) نمبر ۷ (دق) بابتہ شوال ۱۳۲۳ھ

کیا قیامت ہے۔ ذرا اے اہلِ محشر! دیکھنا ان کی یہ نیچی نگاہیں میرا اوپر دیکھنا
مجھ کو مرگِ ناگہانی کا مزا دیتا ہے۔ ہائے بھول کر میری طرف تیرا ستمگر! دیکھنا
دیکھنے کو دی ہیں جب آنکھیں ہمیں اللہ نے رنج و غم جو کچھ دکھاتا ہے مقدر۔ دیکھنا
نازنیں قاتل مرا کہتا ہے (خنجر پھینک کر) "ہے یہ کتنا سخت جاں اللہ اکبر! دیکھنا"
گنبدِ چرخ کہن میں اب تو جی لگتا نہیں دوسری دنیا میں۔ کوئی دوسرا گھر دیکھنا
تیری۔ غیروں سے جو تھی در پردہ سازش کھل گئی میری آنکھوں میں ذرا آنکھیں ملا کر دیکھنا!
کان جب تک ہیں، ملامت گر کی سننی چاہیے آنکھ جب تک ہے۔ ترا روئے منور دیکھنا
یہ ادائے خاص ہے تجھ ہی میں اے تصویر یار! کوئی تجھ سے سیکھ لے سب کو برابر دیکھنا
ساتھ دے اپنا اگر وہ کافر خاطر نشیں بات کعبے میں ہے کیا؟ اک بار چل کر دیکھنا
آسماں سر پر اٹھا رکھا ہے شورِ عشق سے حضرتِ انسان کی قسمت کا چکر دیکھنا
دار و گیرِ حشر ہے۔ زاہد بھی ہے کیفی بھی ہے کون کرتا ہے بھلا یہ معرکہ سر دیکھنا

([illegible])

۳

اب بھی شیدا ہی زمانے کا زمانہ تیرا — ہائے دن سن وہ ترے۔ اف وہ زمانہ تیرا
ایک ساقی کے نہونے سے۔ ہی کیا بے لطفی — کہ نہیں رنگ وہ۔ ای بزم شبانہ! تیرا
فرط شادی سے جو ہیں۔ دو دو گھڑی تک غش میں — یہ ہی ای عید شب وصل! دوگانہ تیرا
ضد۔ لڑکپن کی گئی۔ اب ہی۔ جوانی کا غرور — نہ رہا وہ۔ نہ رہے گا یہ زمانہ تیرا
دلِ بیتاب سنبھل! خوف ہی رسوائی کا — حال دیکھے نہ کوئی مضطربانہ تیرا
کہہ دے کہ "ہم آجائیں گے انشاء اللہ" — گو ارادہ نہ سہی مستقلانہ تیرا
دل چرایا ہی مرا کس نے۔ خدا ہی جانے — نام لیتا ہی کوئی بے ادبانہ تیرا
میں بھی خواہ جہاں۔ اور جہاں میرا عدو — تو۔ زمانے سے خفا۔ اور۔ زمانہ تیرا
ہوتی ہیں عاشق و معشوق میں جو جو باتیں — وہ کہانی ہی مری۔ یا ہی فسانہ تیرا
دل کو تسکین تو دے۔ او قدر انداز اول — کہیں چوکے نہ تڑپنے سے نشانہ تیرا
میری سوختیں۔ اور اک تری بے پروائی — لاکھ شکوے مرے، اور ایک بہانہ تیرا
رنج و راحت کے مزے، سب کو کم و بیش ملیں — غیر کا ساتھ۔ مرا ہاتھ ہو۔ شانہ تیرا
مجھ سے کچھ کم نہیں ای عشق! تری رسوائی — جس سے سنیے۔ وہ سناتا ہی فسانہ تیرا
مجھ کو تاخیر کا شکوہ نہیں۔ ہاں اور سنور! — آئنہ تیرا ہی۔ زلفیں تری۔ شانہ تیرا
کس سے شکوہ ہی شکایت ہی یہ کس سے کیفی!
کوئی بیگانہ یہاں ہی نہ یگانہ تیرا

صحیفہ جلد (۳) نمبر (۲و۳) (بابتہ شوال و ذوالقعدہ ۱۳۲۵ھ)

نہوا وعدۂ وصل آپ سے پورا نہوا — کبھی امروز کا فردا۔ پس فردا نہوا
جب میں کہتا ہوں کہ "وعدہ کوئی پورا نہوا" — بن کے ان جان وہ۔ پھر پوچھتے ہیں "کیا نہوا؟"
یوں تو ہونے کو۔ ہی وہ کون؟ جو شیدا نہوا — وہی عاشق ہی جسے تم کہو "ایسا نہوا"
پھوٹ کر۔ جزو دلِ خوں شدہ ہو جاتا تھا — آبلہ دل کا۔ حبابِ لبِ دریا نہوا
گتھیاں قسمت برگشتہ کی سلجھائے وہ کیا — جس کے ہاتھوں سے کبھی بند قبا وا نہوا

ہو رہا ہی کوئی بدنام۔ کسی کے باعث
یہ بھی کچھ آپ کو معلوم ہوا یا نہوا؟

ہم کو کیا کیا نہ کیا ترکِ وطن نے بدنام
پردۂ اہلِ جنوں دامنِ صحرا نہوا

یاد تیری نہیں جاتی ہی ہمارے دل سے
یہ مرض وہ ہی۔ جو جینے سے بھی اچھا نہوا

اُن کے آنے سے ملا چین۔ تو وہ کہتے ہیں
"دیکھنے آے تھے جو ہم۔ وہ تماشا نہوا"

جو کہا تھا۔ وہی کہتا ہوں۔ کہوں گا وہی
کوئی ایسا ہی۔ نہوتا ہی۔ نہوگا۔ نہوا

نہ رکھا بے سروپائی نے کہیں کا بھی ہمیں
ہم کسی کے نہوے۔ کوئی ہمارا نہوا

کبھی پورا نہوا عمر بھر اقرارِ وصال
اُن سے ایفا نہوا۔ ہم سے تقاضا نہوا

تم وفادار نہیں کیا۔ کہ ستمگر بھی نہیں
وعدہ کیسا۔ کہ ستم بھی کوئی پورا نہوا

میں نے وہ ضبط کیا۔ جو مرے امکاں میں نہیں
تم نے وہ ناز کیا۔ جو تمھیں زیبا نہوا

حُسن کیا حُسن۔ پس پردہ جو مستور رہا
عشق۔ کیا عشق۔ جو بازار میں رسوا نہوا

آہ بے ساختہ نکلی ہی یکایک دل سے
ہاے اس وقت، مرا روٹھنے والا نہوا

ہم کو **کیفی** نظر آتا ہی اُسی کوچے میں
جو مقیمِ حرم و دیر و کلیسا نہوا

رسالۂ اردو حیدرآباد جلد ۴ نمبر ۳ دہم سنہ ۱۹۱۰ء

دھیان ہم نے ترا۔ او شعبدہ گر! چھوڑ دیا
چھوڑنے کا تو نہ تھا قصد۔ مگر۔ چھوڑ دیا

تجھ کو اللہ پرا ہی دردِ جگر! چھوڑ دیا
کہ۔ دوا نے بھی۔ دعا نے بھی۔ اثر چھوڑ دیا

جب وطن میں ہمیں ملنے لگے غربت کے مزے
ایک مدت سے جو تھا قصدِ سفر۔ چھوڑ دیا

طرفہ عیار ہی۔ وہ شوخ نگہ۔ دیدہ دلیر
مرغِ دل پر مرے۔ شہبازِ نظر چھوڑ دیا

دل جگر لے کے۔ براہ کرم اُس ظالم نے
دردِ دل چھوڑ دیا دردِ جگر چھوڑ دیا

باغِ دنیا کے تماشے بھی۔ ہیں اُس کی قدرت
کور چشمی ہی یہ زاہد نے اگر چھوڑ دیا

زاہدِ خشک کو محشر میں ہوی کیا حسرت
جب فرشتوں نے مرا دامنِ تر چھوڑ دیا

مجھ سیہ بخت کی جس دن سے ہوی دامنگیر
شبِ فرقت نے۔ گریبانِ سحر چھوڑ دیا

دنیا میں جو معشوق ستمگار نہ ہوتا
عاشق کبھی لذت کشِ آزار نہ ہوتا

امیدِ عیادت نے کیا مجھ کو پشیماں
ورنہ کبھی اس درد کا اظہار نہ ہوتا

رہتی کوئی دن اور تمنائے عیادت
اے کاش! علاجِ دلِ بیمار نہ ہوتا

اے شانِ کریمی ترے دشمن ہیں یہ، یا ہو
کیا بات کہ میں ہی اور گنہ گار نہ ہوتا

شہرت کے لیے ہوتی ہے ایمان فروشی
ورنہ کبھی اسلام پہ ادبار نہ ہوتا

(ق)
میں اپنا تخلص بھی تو کیفی نہیں کرتا
اللہ! ترا نام جو غفار نہ ہوتا ...

(ت)

۱۳۱۰ء سے ۱۳۲۶ء تک

بجلیاں کوندتی ہیں اور ہے برسات کی رات
اب کہاں جاتے ہو؟ رہ جاؤ یہیں رات کی رات

چھیڑ ہیں یا ہیں ادب، ناز و ستم، شرم و غضب
کس تکلف سے کٹی پہلی ملاقات کی رات

رات دن ہوتی تھی کیا کیا مری خاطر داری
وہ تواضع کے رہے دن نہ مدارات کی رات

تہمت بد نظری، آنکھ چرانے کا گلہ
بحث کیا چھڑ گئی تھی شرحِ اشارات کی رات

روز و شب، خلوت و جلوت میں بہم رہتے تھے
اب ملاقات کا دن ہے نہ ملاقات کی رات

اے زہے طالعِ بیدار! کہ ہم خواب ہے وہ
میں تو اس رات کو سمجھا ہوں کرامات کی رات

دن نکلتے ہی نکلنے لگیں آنکھیں دیکھو!
تم نے کھائی تھی قسم سچ کہو کس بات کی رات

باتوں باتوں میں شبِ وصل کہیں بھور نہ ہو
آج کی رات نہیں حرف و حکایات کی رات

رند پی پی کے گلے ملتے ہیں کیا ایک سے ایک
عید کا دن ہے کہ ہے اہلِ خرابات کی رات

نہ اجالے سے ہی مطلب نہ اندھیرے سے غرض
دن خرابات کا دن رات خرابات کی رات

بے تری دید کے آفت میں ہے کیفی شب و روز
دن قیامت کا ہے دن رات بلیات کی رات

ج

۱۳۱۷ سے ۱۳۲۷ تک

آنکھوں سے نکلتے ہیں مرے لخت جگر آج | گھر دھونے کو بیٹھے ہیں مرے دیدۂ تر آج
آتی ہے جو کل موت، وہ آئے مرے گھر آج | ہو جائے وفا وعدۂ فردا ترا گر آج
کچھ اس کی خبر ہے؟ کہ نہیں کل کی خبر آج | کس سوچ میں بیٹھا ہے جو کرنا ہے وہ کر آج
پہنچے انھیں کس طرح مرے دل کی خبر آج | تاثیر ہے نالوں میں نہ آہوں میں اثر آج
پھرتی ہے نگاہوں میں تری صورت زیبا | آنکھوں کو مری لگتی ہے خود میری نظر آج
دامان شب ہجر کا پیوند لگا...... ہے | ہو گا نہ کبھی چاک گریبان سحر آج
کس کے گل نقش کف پا کی ہے یہ خوش بو | جنت سی مہکتی ہے مری راہ گزر آج
حسرت نے مری مجھ کو کیا زندہ بگور آہ | اس نے تو مرے قتل پہ باندھی ہے کمر آج
مجبور ہوں میں اور تو مختار ہے مالک | کل جس سے میں نادم رہوں ایسا تو نہ کر آج
سنتا ہوں غریبوں پہ ہے عام اس کی نوازش | ہے اپنے وطن ہی میں مرا قصد سفر آج
آمادۂ بخشش ہے ادھر شان کریمی | پھیلائے ہوے ہوں میں ادھر دامن تر آج
غافل! تجھے کل سامنے جانا ہے کسی کے | کچھ دل میں خدا کے لیے اللہ سے ڈر آج
اک روز بھی وہ بزم تصور میں نہ ٹھیرا | ہم کہتے رہے لاکھ، ٹھہر آج ٹھہر آج
ہو ختم شب وعدہ تو پروا نہیں مجھ کو | جتنا ہو سنورنا تجھے او شوخ! سنور آج

(مشاعرہ) کیا جانے یہ کس شوخ سے در پردہ لڑی ہے (۱۳۲۴)
کیفی تری آنکھوں سے ٹپکتا ہے اثر آج

ر

۱۳۱۷ سے ۱۳۲۷ تک

وہ برجستہ فسانہ ہے زبان شمع تربت پر | کھلے گی جس کی رنگینی بیاض چشم عبرت پر

ہوئی ہے وضع داری ختم اپنی شامِ فرقت پر
علی الرغم زمانہ آج تک ہے ایک حالت پر

ہمارے قتل سے بھی رونق آئی رنگِ وحشت پر
پڑے ہیں چاک کیا کیا چادرِ خونِ شہادت پر

ہمارے داغِ دل کی دیدنی ہے گرم بازاری
کہ پانی پھر گیا سرچشمۂ مہرِ قیامت پر

اڑائی دھجیاں دستِ جنوں نے اس سلیقہ سے
گماں میرے گریباں کا ہے دامانِ قیامت پر

ہوئی ہے تنگدستی وجہِ توبہ ورنہ اے ساقی!
کفِ افسوس ملنا دال ہے تجدیدِ بیعت پر

تری بیداد کے خوکردہ بسمل کو نہو کیوں کر
گماں نیۂ زخمِ جگر صبحِ قیامت پر

کراماً کاتبیں کی نکتہ چینی سے ہمیں کیا ڈر؟
نہ آیا حرف کوئی آج تک تحریرِ قسمت پر

شبِ فرقت کی بزم آرائیاں کس بات میں کم ہیں؟
اگر ملنا ترا موقوف ہے روزِ قیامت پر

عدم ہو کر بھی آثارِ وجود اچھوں کے اچھے ہیں
ہنسی آجاتی ہے اب بھی گذشتہ عیش و عشرت پر

خلافِ وضع داری چھیڑ کر کی بات اس بت سے
مری ذلت نے جھاڑو پھیر دی گردِ کدورت پر

ترا تعظیم کو اٹھنا، ترا تسلیم کو جھکنا!
فریب و لافِ دل جوئی قیامت ہے قیامت پر

عجب ہنگامہ ہے ان کی غلط انداز نظروں کا
امیدیں ٹوٹ پڑتی ہیں شکستہ خاطرِ حسرت پر

مجھے ہونا پڑا منت پذیرِ طعنۂ دشمن
لبِ زخمِ جگر کا دانت ہے شورِ ملامت پر

بخوفِ بے خودی کی مے سے توبہ تیرے وحشی نے
کہیں آنچ آتشِ سیال کی آئے نہ وحشت پر

عدو کو دیکھ کر میری طرف وہ دیکھنا تیرا
ستم پر ہے ستم، تازہ قیامت ہے قیامت پر

حسینانِ جہاں سے رات دن رہتی ہے ہم آغوشی
نہو تا کاش مجھ کو رشک اتنا اپنی قسمت پر

خلوص و یک دلی کا نام بھی لیتا نہیں کوئی
مدار اب دوستی کا رہ گیا صاحب سلامت پر

رہینِ منتِ ساقی رہوں گا عمر بھر کیفیؔ!
اگر مل جائے کوئی جام دستارِ فضیلت پر

(مشاعرہ بتقریب جشنِ تاج پوشی ایڈورڈ معظم سنہ ۱۹۰۲ء)

چھپی ہے تم نے کب افشانِ جبیں روئے تاباں پر
یہ بسم اللہ کے اعداد ہیں سرلوحِ قرآں پر

لگایا ضبط نے یہ عیب کاوشہائے پنہاں پر
کہ زخمِ ناخنِ وحشت بھی تکمہ ہے گریباں پر

مرے کلکِ گہر پاش و دُرافشاں کے مقابل میں — ثبوتِ قطرہ دُزدی ہو چکا ہے ابرِ نیساں پر[١]

کمینوں کی خباثت سے حذر لازم ہے انساں کو — کہ ہو جاتا ہے قبضہ اہرمن کا بھی سلیماں پر

کریں کس مُنھ سے ہم شکوہ فلک کا حق بجانب ہے — کہ ہوتی ہے نظر صیاد کی مرغِ خوش الحاں پر

ہیں فرسودۂ پا ہیں سودۂ خاک و حشت آگیں — بنا ہے ایک عبرت زا سماں گورِ غریباں پر

نہیں معلوم کس مے کش کی خاطر ہے تجھے یارب! — کہ اُٹھ اُٹھ کر برستی ہیں گھٹائیں بزمِ رنداں پر

عروسانِ چمن کی تازگی ہے دید کے قابل — ق — بہار آئی ہے اک جوبن برستا ہے گلستاں پر

گرہ اُنتیسویں ہے آج اس سلطانِ عادل کی — جو رکھتا ہے نظر انصاف کی ہندو مسلماں پر

الٰہی! تیرے عز و شان کا سایہ ہے تا حشر — نظام الملک آصف جاہ محبوب علی خاں پر[٢]

قیامت تک رہے سایہ خدایا ظلِ سبحاں کا — مہاراجہ کشن پرشاد۔ چندو لعل دوراں پر[٣]

وزیرِ شاہ کا لطف و کرم ہر روز افزوں ہو — علو ہمت، امانت و نت راجہ رائے رایاں پر[٤]

ریاست حیدرآباد دکن کی حشر تک یارب! — رہے سرسبز و چشمک زن فضائے باغِ رضواں پر

دکن ہے آج کل اربابِ علم و فن کا مامن ہے — لکھا ہے خطِ نستعلیق سے گردونِ گرداں پر

خبر ہے آنے والے ہیں ظہیرؔ[٥] دہلوی کیفیؔ!
(ق) دکن کو فخر کرنا زیب دے گا ایسے مہماں پر

---

١ مصرعِ طرح ٢ حضرت غفراں مکاں علیہ الرحمہ (٣٠ رمضان ١٣٢٩ھ)

٣ سرِ یمین السلطنۃ بہادر (شاد) پیشکار و مدار المہام وقت حال صدر اعظم دولت آصفیہ۔ آپ راجایانِ راجہ چندو لعل مہاراجہ بہادر (شاداں) بیکنٹھ باشی (د ١٢٦١ھ) مدار المہام دولت آصفیہ کے چشم و چراغ اب و جد ہیں مہاراجہ شاداں کی علم دوستی اور داد و دہش پر تواریخ دکن شاہد ہیں۔ ١٢ .... جامع

٤ راجہ لچھمن راؤ نام راجہ رائے رایاں امانت و نت خاندانی خطاب۔ آپ بڑے علم دوست اور نہایت نیک نفس امیر تھے اکثر سال گرہ مبارک کی تقریب میں مشاعرہ منعقد کرتے۔ ١٣١٩ھ میں تہنیت سال گرہ اعلیٰ حضرت غفراں مکاں علیہ الرحمہ (٣٠ رمضان ١٣٢٩ھ) ایک علمی رسالہ (نسیم دکن) ماہوار اپنی سرپرستی میں مولوی محمد نادر علی صاحب برتر غازی پوری کے اہتمام سے جاری کیا تھا جو غالباً ١٣٢٣ھ میں بند ہو گیا۔ .... ١٣ جمادی الثانی ١٣٣١ھ کو ایک عرصہ کی علالت کے بعد انتقال ہوا۔

٥ استاد مسلم الثبوت، سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیرؔ دہلوی تلمیذ رشید خاقانی ہند حضرت ذوقؔ دہلوی جو حیدرآباد دکن کے شعر و سخن کے چرچے کھینچ لائے تھے ٩ ربیع الاول ١٣٢٩ھ روز شنبہ کو اسّی سے زیادہ سن میں یہیں انتقال ہوا۔ دائرہ میر میں سپرد خاک کیے گئے۔ مصنف نے تاریخ کہی تھی جس کا مادہ یہ ہے "آہ ورود ظہیر" ١٣٢٩ھ .... جامع

تسلط بعد مجنوں کے ہوا اپنا بیاباں پر — کہ پرچم بن کے دامن، رہ گیا خارِ مغیلاں پر
اگر قبضہ ترے بسمل کا ہو جاتا نمکداں پر — قرار پار ہائے دل نہ ہوتا، نوکِ مژگاں پر
یہ کس مہ وش کی ابروئے ہلالی سے ہے دل زخمی — کہ پٹی چادرِ مہتاب کی ہے زخمِ خنداں پر
نظر بازوں کو دھوکا اعتبارِ نام پر کیوں ہے — کبھی قمری نظر آتی نہیں سروِ چراغاں پر
سیہ روئی، عیاں ہے سرکشی سے تیرہ باطن کی — دھواں کب ہے فروغِ لمعۂ شمعِ شبستاں پر
ہماری تیرہ بختی کا نمونہ ہو گیا ظاہر — ہوا کیا خاک اثر، آنسو کا اخگر ہائے سوزاں پر
مری آوارگی کی قدر، خیاطِ ازل کو ہے — کیا ہے رختِ وحشت، قطع میرے جسمِ عریاں پر
پریشانی ہے میری باعثِ مجموعیِ خاطر — کہ رحم آتا ہے زلفِ یار کے حالِ پریشاں پر
گدا و شاہ معناً ایک ہیں لیکن ہے فرق اتنا — کوئی ہے شیرِ قالیں پر۔ کوئی شیرِ نیستاں پر
مآل پائے مالی نے کیا ہے صاحبِ نسبت — ہوا ہے بے نشانی کا گماں گورِ غریباں پر
دمِ گریہ بنا چاکِ جگر، رسوائی کا پردہ — بڑا احسان ہے خورشید کا، اس شبنمستاں پر
ترے وحشی کی نظروں میں، نچے کیا چرخِ مینائی — چنے ہیں شیشہ آلات اس نے ایسے طاقِ نسیاں پر
ہوئی ہیں ہڈیاں گھل گھل کے چونا تیرے قیدی کی — سپیدی سی نظر آتی ہے اب دیوارِ زنداں پر
کرے کیا پنجۂ وحشت، برا ہو ناتوانی کا — کہ پاسِ وضع کا چھدا رہا آخر گریباں پر

غزل ہے۔ یا کوئی طومار ہے۔ بس چپ رہو کیفی!

مشاعرۂ سالگرہ حضرت آصف جاہ غفران مکان — گراں ہوتی ہے تطویلِ سخن، طبعِ سخنداں پر — بابت سنہ [illegible] ہجری (منعقدۂ جناب ضیغم صاحب)

کہیں پوشیدہ ہیں وہ عشق کی نیرنگیاں ہو کر — کہیں ظاہر ہیں جلوے حسن کی رنگینیاں ہو کر
عدو کی افترا پردازیوں کی قدر کرتا ہوں — کہ تیرا نام چمکے گا مری بدنامیاں ہو کر
مری ہر دلعزیزی سے مجھے ہے خوفِ آزادی — عجب کیا ہے جو نکلوں نالۂ زندانیاں ہو کر
یہی عالم رہا گر سوزِ دل کی بے قراری کا — در و دیوار گر جائیں گے اک دن بجلیاں ہو کر
مجھے حاصل نہ ہو کیوں ذوقِ وصل و لذتِ ہجراں — وہ میرے دل میں رہتے ہیں مری بے تابیاں ہو کر

ہمارا دستِ وحشت کیوں نہ ہو سرمایۂ نازش
ہوا دامن دراز اپنا۔ گریباں دھجیاں ہو کر

مری گستاخیوں نے بے تکلف کر دیا اُن کو
ہوا کیا خوب نیک انجام بدعنوانیاں ہو کر

وہاں وعدہ خلافی کی ہوا کرتی ہیں تجویزیں
یہاں ہر روز رہ جاتی ہیں بزم آرائیاں ہو کر

تسلی بخش غمخواروں کے فقرے کام کیا دیں گے؟
ادائیں ان کی رہتی ہیں جگر میں برچھیاں ہو کر

ترقی خواہِ عمر و دولت و اقبالِ آصف ہے
دعا میری شریکِ محفلِ روحانیاں ہو کر

مجھے منزل پہ پہنچایا ہے میری ناتوانی نے
کہ چڑھ سکتا ہوں بامِ یار تک پرچھائیاں ہو کر

ادا کس منہ سے ہو شکر اس ادائے خاص کا یارا
دعائیں ان کے دل سے لب تک آئیں گالیاں ہو کر

نہ وہ کس بل رہا ہم میں۔ نہ وہ طاقت رہی کیفی!
نکمے ہو گئے مغلوب تن آسانیاں ہو کر

مشاعرہ سالگرہ مسعود بصفت حضرت غفران مکان بابت ۱۳۲۱ھ

ک

(سنہ ۱۳۱۷ سے ۱۳۲۷ تک)

میں ڈرتا ہوں نہ رکھ زندہ مجھے اُس دن کی آفت تک
سلامت حضرت واعظ رہیں یا رب قیامت تک

رہا ہے نازِ مہر و عشق پر ہم کو بھی مدت تک
مگر لب پر نہیں آتا ہے اب نامِ محبت تک

مجھے کس سے شکایت ہے (؟) سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جدا ہیں اپنے معنوں سے مگر حرفِ شکایت تک

مجھے وہ دیکھنے آئیں خوشی سے میں تو اُٹھ بیٹھوں
مگر ڈر ہے نہ اُٹھ جائے کہیں رسمِ عیادت تک

حجاب اتنا تو عاشق سے نہ کر بزمِ تصور میں
وہ تکتا ہے تری صورت کو تو بھی اُس کی صورت تک

قیامت کا اجارہ کیا ہے؟ جو ملنا ہو تو اب ملیئے
کہ دم کا کیا بھروسہ کون جیتا ہے قیامت تک

نہ ہوگا کوئی ہم سا بے ٹھکانہ خانہ آوارہ
ٹھکانے سے نہیں لگتی ہماری کوئی محنت تک

تری کس کس ادائے دلستاں پر جان صدقے ہو؟
رسائی ہو نہیں سکتی ہماری کنہہ قدرت تک

تم اپنا کل کا وعدہ آج ہم سے پورا کر دیکھو
ابھی ہم سر کے بل آتے ہیں میدانِ قیامت تک

وفورِ شرم سے چھپتے ہیں زیرِ دامنِ مژگاں
نکل سکتے نہیں ہیں آنکھ سے اشکِ ندامت تک

سرمست

گیا بچپن، شباب آیا، مجھے پہچاننا کیسا؟
نہیں پہچان سکتے ہائے تم خود اپنی صورت تک

مجھے ارشاد ہو! میں ناز برداری کو حاضر ہوں
سنبھل سکتا نہیں جب آپ سے بارِ نزاکت تک

ہماری خاکساری کیوں نہیں بھرتی نگاہوں میں
ترے دل میں تو گھر کر لیتی ہے گرد کدورت تک

ہمارے بعد مٹی بھی نہ کر برباد غیروں کی
جو تو چاہے تو حاضر ہے ہماری خاکِ تربت تک

الٰہی کثرتِ عصیاں سے میں اتنا پشیماں ہوں
کہ مارے شرم کے ہیں سرنگوں اشکِ ندامت تک

کشود کار کی تم سے توقع کون رکھے گا
رہے محروم جیب البتہ دامانِ دولت تک

گھٹا چھائی فلک پر، دم گھٹا جاتا ہے کیفی کا
سلامت میکدہ تیرا رہے ساقی قیامت تک!

مشاعرہ عرس حضرت نیک شاہ رح

بابتہ ۱۳۲۵ھ۔ بزم ہند ۱۲۔ م ق

ن

(سنہ ۱۳۱۷ھ سے سنہ ۱۳۲۷ھ تک)

آرزو ہے نہ تمنا ہے نہ ارماں دل میں
اب تو ظالم! تری حسرت بھی ہے مہمانِ دل میں

اُڑتی ہے خاک کدورت مرے ویرانِ دل میں
میزباں دل میں رہا کوئی نہ مہماں دل میں

زلف پر خم میں دل آویز پریشانی ہے
آپ آئے تھے مگر میرے پریشانِ دل میں

عالم نزع ہے یا ترکِ تعلق کا خیال
یاس امید سے ہے دست و گریبانِ دل میں

کہہ رہا ہے کہ محبت نہ کریں گے اب سے
یا الٰہی! کوئی بڑ بول ہے پنہانِ دل میں

ایک زنجیر کے وابستہ ہیں آزاد و اسیر
ہے عجب طرفہ طلسمات کا زندانِ دل میں

کثرتِ یاس سے کم داغِ تمنا نہ ہوا
نظر آتا ہے چراغ تہِ دامانِ دل میں

بے سبب بھی کوئی بے چین رہا کرتا ہے؟
کچھ نہ کچھ ہے اثرِ کاوشِ مژگانِ دل میں

امتحاں آج ہے تیری قدر اندازی کا
تیر سینے میں رہے تیر کا پیکانِ دل میں

اُس سے انصاف ستم ہائے محبت کی امید
جس کی آنکھوں میں مروت ہے نہ ایمانِ دل میں

داد جی کھول کے ہم جوشِ جنوں کی دیتے
کاش ہوتا کوئی سنسان بیابانِ دل میں

ڈھونڈ لیں گے کوئی ہم موت کا حیلہ ظالم!
ہونے دیں گے نہ کبھی تجھ کو پشیمانِ دل میں

مٹ گئے داغ مگر اُن کے نشاں باقی ہیں
یعنی آباد ہے اک شہر خموشاں دل میں

(شاعرہ سنہ ۱۳۲۰ھ)

خدا کی یہ خدائی ہے حسیں اکثر نکلتے ہیں
مگر کیفی! کہیں ایسے پری پیکر نکلتے ہیں

ہزاروں منتوں پر گھر سے وہ باہر نکلتے ہیں
بڑی مشکل سے ارمان دل مضطر نکلتے ہیں

کہاں کی آہ، کیسے اشک اب ہم ضبط کرتے ہیں
نکلنے دو اگر قبضے سے بحر و بر نکلتے ہیں

ہمارے قتل کے سامان ہوتے ہیں وہاں کیا کیا
کبھی تیغیں نکلتی ہیں، کبھی خنجر نکلتے ہیں

وہ کہتے ہیں کہ "تیری بات میرے دل میں چبھتی ہے"
نکلتے ہیں زباں سے حرف یا نشتر نکلتے ہیں

بہار تازہ آئی ہے بلا نوشوں کا مجمع ہے
تہی میخانے سے جام و سبو ساغر نکلتے ہیں

مری حالت پہ روتے ہیں چھپا کر منہ نصیحت گر
اب ایسے خشک مغزوں کے بھی آنسو تر نکلتے ہیں

نکل آئے ہیں ساقی! اس طرف لا اور تھوڑی سی
اگرچہ دام پہلے کے بھی کچھ ہم پر نکلتے ہیں

نہیں معلوم یہ کس دل جلے کا ڈھیر ہے یارب!
کہ آتش بار اب تک زیر خاکستر نکلتے ہیں

جلایا دور ہی سے چھینٹے دے کر مجھ کو ساقی نے
شرارے آتش سیّال سے کیوں کر نکلتے ہیں

دکھائی کچھ نہیں دیتا کہ اک دیوار حائل ہے
بجائے اشک آنکھوں سے مری پتھر نکلتے ہیں

جسے کہتے ہیں عاشق وہ نہیں ملتا ہے ڈھونڈے سے
مری جان چاہنے والے تو یوں اکثر نکلتے ہیں

مرے نالے، مرے آنسو ہیں کس کو فضیلت دوں
کہ وہ ان سے سوا۔ اور اُن سے یہ بہتر نکلتے ہیں

کہا میں نے سناؤں ماجرا اپنا تو فرمایا
"گئے گزرے ہوئے وقتوں کے پھر دفتر نکلتے ہیں"

یہ کیا حجت ہے ای ساقی! نہ لینا اک نہ دینا دو
خوشی سے مانگ لے یوں دام کب ہم پر نکلتے ہیں

بلا ہیں چھوٹے چھوٹے تیرے گیسو اے بت کمسن!
بڑے ہو کر یہی کافر تو غارت گر نکلتے ہیں

ٹپکتے ہیں جو قطرے خون زخم سنگ طفلاں سے
سمجھ کر لعل اُٹھاتا ہوں مگر پتھر نکلتے ہیں

غرور۔ اور اس قدر پھر بچپنے کے ملنے والوں سے
جواں ہوتے ہی کیا اُنجناب کے کچھ پر نکلتے ہیں

اُترتی ہیں ہمارے اضطراب شوق کی نقلیں
وہ عاشق بن کے دل تھامے ہوئے مضطر نکلتے ہیں

رہائی دامِ کاکل سے ہماری ہو چکی کیفیؔ!

(ق) نکالے سے کہیں تقدیر کے چکر نکلتے ہیں ع

تکلف کیا ہے میرے گھر کو اپنا گھر بنانے میں
کہ تکلیف آپ کو ہوتی ہے ہر روز آنے جانے میں

رہائی پا کے ہم، دم چھوڑتے ہیں قیدخانے میں
رہے یہ بعد اپنے۔ یادگار اپنی زمانے میں

پہیلی اک نئی ہوتی ہے تیرے ہر بہانے میں
کہ اس کا بوجھنا بھی دیکھنے میں مونہ کھانے میں

تری مجذوب کی بڑ ہے سمجھ سن تو لو آخر
بہت سی کام کی باتیں بھی ہیں میرے فسانے میں

دیا ہے عشق جس کو صبر بھی تھوڑا سا دے اس کو
الٰہی! ہے کمی کس چیز کی؟ تیرے خزانے میں

بنایا مجھ کو بے صبر اس قدر کیوں۔ کیا کہوں سچ ہے
نہیں ہے دخل بندے کو خدا کے کارخانے میں

ہمیشہ کے لیے سائے میں گل کے سو گئی بلبل
یہ کس کو ڈھونڈھتی ہے آتشِ گل آشیانے میں؟

عدو کا خرمنِ امید کیوں جلتا نہیں یا رب؟
جھلک برقِ بلا کی ہے کسی کے مسکرانے میں

پرانی صحبتوں کا حال سن کر دل بھر آتا ہے
ہمیں پیدا کیا کیفیؔ! خدا نے کس زمانے میں؟

(۱۰۔ رمضان ۱۳۲۲ھ)

ع مصنفؒ نے خود ایک مشاعرہ ۱۳۲۲ھ میں کیا تھا جس کی یہ غزل ہے مشاعرہ کا اشتہار بھی اپنے ہی نام سے دیا اور یہ لکھا تھا کہ علامہ آقا سید علی شوستری، شاد الملک طوطی (مرحوم ۲۰۔ ذی قعدہ ۱۳۴۴ھ) اور جہاں استاد حضرت داغ دہلوی (مرحوم ۹۔ ذی حجہ ۱۳۲۲ھ) نے مشاعرے میں آنے کا تحریری وعدہ کیا ہے۔ یہ مشاعرہ بڑے پیمانہ پر ہوا تھا۔ ہند و دکن کے باکمال شعرا حسن اتفاق سے شریک تھے لوگ آج تک اس مشاعرے کی کیفیت مزے لے لے کر بیان کرتے اور اکثر شعر سناتے ہیں۔ لکھنؤ کے شہرت یافتہ مرثیہ گو جناب پیارے صاحب رشید (مرحوم) کے یہ دو شعر لوگوں کو یاد ہیں

ہوا ہے سخت مشکل دفن ہونا تیرے وحشی کا
جہاں پر قبر کھودی جاتی ہے پتھر نکلتے ہیں

رشید آغاز الفت سے کہیں انجام بہتر ہے
کہ بحرِ عشق کے ڈوبے لبِ کوثر نکلتے ہیں

مشاعرہ شام سے شروع ہو کر صبح کے دس بجے ختم ہوا۔ طعام و قیام کا انتظام مصنف کے والد ماجد مولوی حاجی سید نظام الدین احمد رضوی (مہاجر) نے بڑے اہتمام سے کیا تھا۔ مشاعرہ نواب کلیانی (مرحوم ۲۔ صفر ۱۳۴۲ھ) کی حویلی واقع تالاب میر جملہ پر ہوا نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی نے پہلی مرتبہ اسی مشاعرے میں موسیقی لحن پر اپنی غزل سنائی تھی جیسے ہم آج کل عام طور پر مشاعروں میں سن رہے ہیں۔ اس مشاعرے کا حال ہمارے مکرم دوست مولوی حکیم سید محمد علی صاحب عرش ملیح آبادی (مرحوم ۱۴۔ شعبان ۱۳۷۸ھ) نے اپنے روزنامچے سے سنایا تھا۔ اس وقت حافظے نے جس قدر مدد کی وہ سپردِ قلم ہے۔ (جامع)

مانتا ہوں کہ مجھے تاب نظارا تو نہیں — دور ہی رہیے مگر یہ بھی گوارا تو نہیں
کیوں خفا ہوتے ہو مجھ مست پہ ای حضرت شیخ! — میں گنہ گار خدا کا ہوں، تمھارا تو نہیں
آپ فرمایئے! کچھ وجہ گرفتاری دل — ظاہرا کوئی قصور اس میں ہمارا تو نہیں
کون دیتا ہی تسلی ہمیں تنہائی میں؟ — خلوت خاص میں وہ انجمن آرا تو نہیں
دل کسی کا، نہیں ملتا، نہیں ملتا ہم سے — غیر کی ملک ہی کچھ اپنا اجارا تو نہیں
دولت وصل ملے، یا درم داغ فراق — دل فروشوں کی تجارت میں خسارا تو نہیں
ای منجم! تری باتوں سے ہو کیوں کر تسکیں — جو نہو چرخ میں، وہ میرا ستارا تو نہیں
خال ہندو کو ترے کعبۂ دل دیتا ہوں — میرے قبضے میں، سمرقند و بخارا تو نہیں
غیر سے آنکھ تری دیدہ و دانستہ لڑی — یہ کچھ افسانۂ اسکندر و دارا تو نہیں
جس کو ہم سمجھے ہوے ہیں شب تاریک فراق — شاہد صبح قیامت کا اُتارا تو نہیں
کیا بگاڑے گا؟ بگڑ کر، فلک سفلہ نواز — پاس اپنے علم و طبل و نقارا تو نہیں
تو ہی کچھ، رحم مرے حال پہ کر ساتھ نہ چھوڑ — بے قراری! مجھے اب صبر کا یارا تو نہیں
دیکھتے ہیں وہ کبھی مجھ کو، کبھی آئینہ — ان اداؤں میں کوئی خاص اشارا تو نہیں
دل، محبت میں تڑپتا ہی۔ مگر کیا آتا؟ — میرے سینے میں، الٰہی! کہیں پارا تو نہیں
آفریں ہمت پروانۂ جاں باز پہ ہو — گو وہ جیتا نہ رہا شمع سے ہارا تو نہیں
اثر عشق سے، شاید کوئی مرتا ہو گا — اس زمانے میں کہیں ہانک پکارا تو نہیں
رزق، ہر حیلے سے دیتا ہی خداوند کریم — منحصر نظم پہ کچھ اپنا گذارا تو نہیں
کس مپرسی کا تقاضا خفقاں کی ہی صلاح — اب سوا ترک وطن کے کوئی چارا تو نہیں
(ق) چھوڑ کر تجھ کو کہاں جائے یہ کیفی، ساقی! — تیری بھٹی کے سوا کوئی سہارا تو نہیں

صحیفہ جلد (۳)، نمبر (۱)
بابتہ رمضان ۱۳۲۵ھ

جگہ ہی بوالہوسوں کی، دل ستمگر میں — خبر نہ تھی کہ ہی پوشیدہ آگ پتھر میں

نہیں ہے قطرۂ مے تک ہمارے ساغر میں
زہے نصیب کہ گردش تو ہے مقدر میں

کبھی ہوئی ہے نہ ہو شانِ انقلاب میں کم
تمام عمر رہے آسمان چکر میں

دکھائی دے مجھے کس طرح سے نشیب و فراز
نگاہ چھوڑ کر آیا ہوں روزنِ در میں

عجب نہیں ہے کہ بس جائے مغفرت کا دماغ
کہ بوئے عطرِ ندامت ہے دامنِ تر میں

چلا ہے مجھ پہ، رقیبوں پہ کیوں نہیں چلتا؟
مرا لہو ہے کہ مہندی ہے پائے خنجر میں

خوشی سے کرتے ہیں پردہ کہ شرمِ وضع رہے
ہم اپنے گھر سے ہیں باہر کہ عید ہے گھر میں

تمہاری چشمِ سخن گو تو مار ڈالے گی؟
کہ خوب بول رہی ہے زبان خنجر میں

ستم ظریف! محبت نما نظر سے نہ دیکھ!!
نہ یہ جتا کہ ہے مرہم بھی تیر کے پر میں

یہاں سے کچھ عدم آباد دور بھی تو نہیں
کہ مرنے والے پہنچتے ہیں کوئی دم بھر میں

وفورِ ذرہ نوازیٔ حضرتِ خورشید[1]
تباہ سفر میں ہوں "دہلی" کے یا ہوں میں گھر میں

(ق)

یہاں تو پوچھنے والا نہیں کوئی کیفی
خدا ہی پوچھنے والا ہے وہ بھی محشر میں

۴ شوال ۱۳۲۵ھ دہلی

زہے قسمت کہ میں ناخواستہ مہمانِ حسرت[2] ہوں
الٰہی! بے خطا تقصیر وارِ شکرِ نعمت ہوں

میں اک گم گشتہ حالت ہستیٔ لاشئ کی حجت ہوں
مری قسمت کو حیرانی یہ ہے میں کس کی قسمت ہوں؟

حقیقت کیا ہے میری؟ نفیٔ حقیقت بے حقیقت ہوں
اگر سمجھو تو عزت ہوں نہ سمجھو تو ذلت ہوں

اگرچہ دور افتادہ ہوں لیکن اہلِ نسبت ہوں
کہ دامن کی ترے جھٹکی ہوئی گردِ کدورت ہوں

شہیدِ خاطرِ ارمانِ خوں گشتہ کی تربت ہوں
کہ میری خاک کہتی ہے کہ "میں اکسیرِ کلفت ہوں"

---

[1] صاحب عالم مرزا خورشید عالم بہادر گورگانی (مرحوم) برادر حضرت داغ دہلوی مرحوم۔ مصنف رح اپنے سفر دہلی میں ان کے مہمان تھے۔ خورشید عالم بہادر نے مصنف کی آمد میں مشاعرہ کیا تھا۔ یہ غزل اسی مشاعرہ کی ہے۔

[2] مولوی سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی، ایڈیٹر رسالہ اردوئے معلی علیگڈھ۔ مولوی مہدی علی خاں نواب محسن الملک مرحوم (۲۰ رمضان ۱۳۲۵ھ) کے تعزیت کے جلسہ کی تقریب میں مصنف رح علی گڈھ گئے تھے مولانا حسرت موہانی نے مصنف کو اپنا مہمان بنا کر ایک مشاعرہ کیا تھا جس میں مصنف رح نے یہ غزل پڑھی۔ (جامع)

محبت گاہ میں ہر روز و ہر شب تحفۂ حیرت ہوں | میں اپنے کام کی ساعت تمھارا وقتِ فرصت ہوں
مجھے ہر رنج میں لذت خوشی سے بڑھ کے ملتی ہے | مگر میں یا الٰہی! عین مقصودِ مسرت ہوں
میں اپنے آپ پر ہرگز تصرف کر نہیں سکتا | کسی کی سامنے رکھی ہوئی گویا امانت ہوں

نہ میں مقدور والا ہوں نہ میں مجبور ہوں کیفی! (ق)
خدا رکھے مجھے، میں بھی خدا کی ایک قدرت ہوں

۱۰ شوال ۱۳۲۵ روز جمعہ — در علی گڑھ نوشتہ شد

بدنام ہوں، ذلیل ہوں، رسوا ہوں خوار ہوں | سب کچھ ہوں میں۔ مگر ترا امیدوار ہوں
میں اور تیرا عشق! یہ سچ ہے نہ جھوٹ ہے | تو خاکسار دوست ہے میں خاکسار ہوں
وعدہ خلافیوں کی شکایت تو اک طرف | لو! آپ کی طرف سے بھی میں شرمسار ہوں
ای غیرت وجود! مٹا دے مرا وجود | کہتا ہے مجھ سا ناشدنی بار بار "ہوں"!
ای عشق! میں نے دل میں چھپائے ہیں تیرے داغ | تو میرا پردہ در۔ میں ترا پردہ دار ہوں
سینے میں حضرت دل مرحوم دفن ہیں | میں، اک شکستہ حال نشانِ مزار ہوں
دنیا میں، پاس خاطر دل سے سبک ہوا | پھر آپ اپنی خاطرِ نازک پہ بار ہوں
یہ سینہ، اور اُن کی مژہ کی خلش غلط؟ | میں آپ اپنے آبلۂ دل میں خار ہوں

کیفی! کسی سے اپنی حقیقت میں کیا کہوں!
اک تختۂ مشق قدرت پروردگار ہوں

مشاعرہ عرس حضرت مبارک شاہ صاحب — بزم [illegible] بابتہ سنہ ۱۳۲۶

خلاف طبع نازک کرتے ہیں جو کام کرتے ہیں | تمھارے چاہنے والوں کو ہم بدنام کرتے ہیں
نہ فکر ہجر میں ہیبت، نہ ذکر وصل میں لذت | نہ ہنس کر صبح کرتے ہیں نہ رو کر شام کرتے ہیں
نہ ہنسنے کا سلیقہ ہے نہ رونے کا طریقہ ہے | غرض، ہر کام بے اندیشۂ انجام کرتے ہیں
نظر بازی کسی کی چشم فتاں سے کچھ آساں ہے؟ | بڑی تدبیر سے وحشی ہرن کو رام کرتے ہیں
ہمارا گریہ بے سود کیا ہے جگ ہنسائی ہے | کہ اپنا وقت، صرف ادعائے خام کرتے ہیں
یہ آنکھیں اور شوق دید؟ یہ دل اور وصل کی امید؟ | خیالات ایسے ایسے آپ کے ناکام کرتے ہیں

ہمارا کام کیا۔ ہم کیا۔ ہمارا نام کیا ہم کیا؟ ۔۔۔ وہ اپنا کام کرتے ہیں۔ ہمارا نام کرتے ہیں
ترے لطف و کرم نے کر دیا گستاخ اس درجہ ۔۔۔ کہ ہم اپنی خطا پر خواہش الزام کرتے ہیں
اُدھر احساں پہ احساں ہیں اُدھر عصیاں پہ عصیاں ہیں ۔۔۔ وہ اپنا کام کرتے ہیں ہم اپنا کام کرتے ہیں
اثر فریاد میں کچھ ہے نہ اندوہ نہانی میں ۔۔۔ تمھیں ہم یاد بھی شاید برائے نام کرتے ہیں

(ق) یہ مستی اور پھر یہ بت پرستی حضرت کیفی!
بھلے مانس! اسی پر دعوئے اسلام کرتے ہیں؟

صحیفہ جلد ۵ نمبر ۲

قیامت کی کشش ہے تیری ڈورے دار آنکھوں میں ۔۔۔ کہ کھنچ آتی ہے جانِ طالبِ دیدار آنکھوں میں
مہکنے کو گلِ داغِ محبت دل میں ہے اپنے ۔۔۔ کھٹکنے کو ہے خارِ حسرتِ دیدار آنکھوں میں
کبھی فرصت جو ملتی ہے تو تیری راہ تکتا ہوں ۔۔۔ فقط اب رہ گئے ہیں زیست کے آثار آنکھوں میں
ہوئی نذرِ جنوں جیب و گریباں آستیں اپنی ۔۔۔ لگا رکھے ہیں ہم نے آنسوؤں کے تار آنکھوں میں
مرے پیشِ نظر ہے رات دن اک شوخ کا جلوہ ۔۔۔ کہو آئے نہ نیند اب کیسے مری بیدار آنکھوں میں
وہ آنکھوں آنکھوں میں کہنے کی باتیں کہہ گزرتے ہیں ۔۔۔ کہاں سے آ گئی ہے قوتِ گفتار آنکھوں میں؟
کوئی دیکھے تمھارے دیکھنے والے کی کیفیت ۔۔۔ لہو میں جوش ہے دل میں محبت پیار آنکھوں میں
ہزاروں ایک سے اک اچھی آنکھیں ہم نے دیکھی ہیں ۔۔۔ مگر آنکھیں ہیں تیری او بتِ عیار آنکھوں میں
ملا کر آنکھ دل لینا ہے بائیں ہاتھ کا کرتب ۔۔۔ سوا اس کے بھرے ہیں بے شمار اسرار آنکھوں میں
ہم اپنا دل دیا کرتے ہیں اچھی آنکھ والوں کو ۔۔۔ وہی چیز اچھی ہوتی ہے جچے جو یار آنکھوں میں
سمجھتے ہو جسے تم مردمک وہ مردمک کب ہے؟ ۔۔۔ ہوا ہے جمع دودِ آتشِ رخسار آنکھوں میں

اُسے ذلت کی پروا ہے نہ بدنامی کا اندیشہ
اگر کیفی کی عزت ہے تری سرشار آنکھوں میں

صحیفہ جلد ۶ نمبر ۲

ہماری طرح نااہلوں کو کیوں ناحق ستاتے ہیں ۔۔۔ شکایت آپ کی سُن سُن کے ہم شرمائے جاتے ہیں
کوئی ہم سا بلاکش آپ نے دنیا میں دیکھا ہے؟ ۔۔۔ کہ کیسے سنگدل کو اپنے سینے سے لگاتے ہیں

غرورِ عشق بڑھتا ہی تری بے اعتنائی سے
کہ لوگ، اک امتیازِ خاص ہے، ہم کو بتاتے ہیں

بگڑ کر، ہم نے کب امید کی تجھ سے منانے کی؟
ادھر تو دیکھ او نا منفعل! ہم مسکراتے ہیں

یہ چلتے چلتے اڑ جانا، یہ بن بن کر بگڑ جانا
ترے انداز اب گستاخیاں ہم کو سکھاتے ہیں

کہاں کا قول، کیا اقرار، کیسا عہد، وعدہ کیا؟
یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، وہ آتے ہیں نہ جاتے ہیں

نہ ہو پاسِ سخن جس کو، وہ انساں کوئی انساں ہے؟
وہی ہیں مرد جو کہتے ہیں منہ سے کر دکھاتے ہیں

محبت کس کو کہتے ہیں محبت اک کسوٹی ہے؟
ہر اک کو چاہ کر ہم اپنے دل کو آزماتے ہیں

فریبِ عشق، اہلِ حسن پر چلتا ہے یوں کیفیؔ!
کہ پہلے اپنے معشوقوں کو ہم عاشق بناتے ہیں

ق

(سنہ ۱۳۱۷ء سے ۱۳۲۷ء تک)

خدا شاہد نہیں اندیشۂ سود و زیاں مجھ کو
تردّدِ بیش و کم کا ہے نہ فکرِ این و آں مجھ کو

بنایا ہے مری غفلت نے جنسِ رائگاں مجھ کو
کروں خدمت کسی کی حوصلہ اتنا کہاں مجھ کو

مجھے غم ہے تو یہ غم ہے کہ غمگیں دوسرے کیوں ہیں؟
وگرنہ جتنا جی چاہے ستالے آسماں مجھ کو

نہیں کھلتا الٰہی! اس سے کیا مطلب ہے یاروں کا
سناتے ہیں مجھے سن کے، میری داستاں مجھ کو

طبیعت دے تو ایسی دے الٰہی! جس سے میں خوش ہوں
اگر دل دے تو ایسا دے جو رکھے شادماں مجھ کو

ہجومِ گل، مری رخصت کا ساماں کر چکا پورا
سلام اب کرتی ہے جھک جھک کے شاخِ آشیاں مجھ کو

ارادہ تو بہت کچھ تھا۔ مگر اب کیا کہوں تم سے؟
سنبھلنے ہی نہیں دیتیں مری بے تابیاں مجھ کو

یکایک آزماتے وہ تو میرا حال کھل جاتا
نہ ہوتی کاش پہلے، اطلاعِ امتحاں مجھ کو

میں اس بے قدریِ عہدِ وفا کی قدر کرتا ہوں
کہو تم شوق سے اے مہرباں! نا مہرباں مجھ کو

سفر کی لذت آمیز آفتوں سے رخصت اے وحشت!
وطن میں ڈھونڈھتی پھرتی ہیں رسوائیاں مجھ کو

مزے اصرار کے انکار کے۔ دونوں کو آئیں گے
اگر میری زباں تجھ کو ملے، تیری زباں مجھ کو

رت

نئی سوجھی، شریک بزم بھی رکھا تو یوں رکھا — جتایا اعتبار اپنا بنا کر پاسباں مجھ کو

وہ روٹھا ہی ذرا اس کو منا دو حضرتِ ناصح! — بڑے سمجھانے والے آئے ہیں حضرت بہا مجھ کو

کوئی گلچیں کے دامن میں کوئی صیاد کے گھر میں — نہ گلشن گل کو راس آیا نہ میرا آشیاں مجھ کو

بظاہر میکدے سے دور رہوں میں اب مگر کیفیؔ!
نہ بھولا ہے نہ بھولے گا مرا پیرِ مغاں مجھ کو

مشاعرہ بزم رندان — بابتہ ۱۳۲۲ ق

دوستی بڑھ جائے اُن سے ابتدا ایسی تو ہو — ابتدا ایسی نہ ہو تو، انتہا ایسی تو ہو

ہم میں اور اُن میں محبت یا خدا ایسی تو ہو — جو سنے وہ بول اٹھے مہر و وفا ایسی تو ہو

رحم اُس بے رحم کو آجائے مجھ کو دیکھ کر — کچھ قصور ایسا تو ہو۔ کوئی خطا ایسی تو ہو

وجد میں ہوں اہلِ نظارہ ملے قاتل کو داد — کچھ تڑپے کشتۂ تیغِ ادا! ایسی تو ہو

تشنہ پھر جائے سکندر آپ خود سیراب ہوں — رہنمائی واہ خضر رہنما ایسی تو ہو

وہ یہ کہتے ہیں کہو اب ہم نہ چاہیں گے کبھی — جی پھڑک اٹھا ہمارا بھی جفا ایسی تو ہو

عرضِ مطلب پر یہ شوخی یہ تبسم دیکھنا — خامشی میں بدلہ سنجی کی ادا ایسی تو ہو

باہمی تکرار یا رب ہوتے ہوتے رہ نہ جائے — کچھ مزا آجائے آپس میں فرا ایسی تو ہو

ہم مریضِ ہجر ناحق مرتے مرتے بچ گئے — اب کے ایسا تو نہ ہو۔ کوئی دوا ایسی تو ہو

مدعا دونوں کا ہے معلوم دونوں کو مگر — گفتگو سے بھی ہو واضح۔ برملا ایسی تو ہو

دل کی دل میں گھٹ کے رہ جائے تو پھر کیا بات ہے — آہ لب تک بھی نہ آئے نارسا ایسی تو ہو

بخشنے والے کو اپنی ایسی بخشش پر ہو ناز — یا الٰہ العالمیں مجھ سے خطا ایسی تو ہو

تمکنت میں سادگی اغماز میں سنجیدگی — ناز میں انداز شوخی میں ادا ایسی تو ہو

کوچۂ قاتل میں مجھ کو گھیر کر لائی ہے یہ — جیتے جی جنت میں پہنچائے قضا ایسی تو ہو

مے جہاں بٹتی تھی کیفیؔ اب وہاں اڑتی ہے خاک
پھر وہ دن آئے۔ زمانے کی ہوا ایسی تو ہو

مشاعرہ بزم رندان — بابتہ ۲۳ و ۱۳۲۱ ق

سرست

فریبِ حسن و لافِ عشق نے رسوا کیا مجھ کو
مرے ناعاقبت اندیش دل نے کھو دیا مجھ کو

مئے معشوق کی ہے قدر، زاہد سے سوا مجھ کو
فرشتو! سچ کہو اُس کو ملے فردوس یا مجھ کو

جہاں تک ہو سکے تم سے کہے جاؤ بُرا مجھ کو
کبھی میں یہ نہ پوچھوں گا کہ تم نے کیا کہا مجھ کو؟

مدد اے ناامیدی! آرزو ہے آبِ حیواں کی
جنابِ خضر سا اِک چاہیے کوئی رہنما مجھ کو

بہت اترائے جاتے ہیں بڑا احسان جتاتے ہیں
عدو کو، گالیاں دیں آپ نے تو کیا ملا مجھ کو؟

نہیں ڈر جان جانے کا مگر ڈر ہے تو یہ ڈر ہے
کہلوائے نہ یہ بے داد! تیری بے وفا مجھ کو

خدا کی دین ہے اس میں کسی کا کیا اجارہ ہے
دیا بے دردِ دل تجھ کو۔ دلِ درد آشنا مجھ کو

نہ وحشت ہے نہ سودا ہے، یہ پھر آوارگی کیسی؟
سمجھ میں کچھ نہیں آتا الٰہی! کیا ہُوا مجھ کو

لگاوٹ کی نگاہیں تاڑ لیں گے تاڑنے والے
قیامت ہے بھری محفل میں تیرا دیکھنا مجھ کو

یہ وحشت، اور ضبطِ آہ و فریاد و فغاں ہے ہے
اُڑا لے چٹکیوں میں کیوں نہ جنگل کی ہوا مجھ کو

یہ بے دردی، یہ بے قدری، یہ بے مہری، یہ بیزاری
نہیں سمجھا میں اب تک آپ نے سمجھا ہے کیا مجھ کو؟

دل اپنا صاف کر کے توڑتا ہوں سنگِ الفت سے
مگر منظور ہے آئینہ عبرت نما مجھ کو

محبت نے بڑھایا حوصلہ اتنا کہ کہتا ہوں
"تمہارے دیکھنے والوں میں بعض نے دیکھا مجھ کو!"

بہار آئی ہے کیفی اب کہیں رکتا ہوں پینے سے
سمجھتے تھے جو اب تک اب نہ سمجھیں پارسا مجھ کو

صحیفہ جلد ۲ نمبر ۲ بابتہ ربیع الاول ۱۳۲۵ھ

ھ

(سنہ ۱۳۱۷ھ سے سنہ ۱۳۲۷ھ تک)

جیسی نبھے نبھائیں گے اُس فتنہ گر کے ساتھ
ہے زندگی بخیر تو چھوڑیں گے مر کے ساتھ

تو کر مقابلہ فلکِ کینہ ور کے ساتھ
بے داد گر کی جوڑ ہے بے داد گر کے ساتھ

شوخی نہ شرم۔ یہ بھی نرالی ہے دل لگی
تم ہم سے منہ چھپاتے ہو آرام کے ساتھ

دل چاہیے مرا تو۔ یہ حاضر ہے لیجیے!
پڑتے ہیں لاکھ کام بشر کو بشر کے ساتھ

مجھ کو شفا ہو تم سے کوئی بدگماں نہ ہو
بہرِ عیادت آؤ مرے چارہ گر کے ساتھ

وہ ہم سے، اور ہم ہیں زمانے سے بے خبر
کس بے خبر کی میل ہے کس بے خبر کے ساتھ

رونے کے ذکر پہ ہمیں آتی ہو اب ہنسی
وہ بات چشمِ تر کی گئی چشمِ تر کے ساتھ

جو لوٹتے ہیں دولتِ دیدار اُن پہ لوٹ ہو
لٹتا ہوں میں تو مفت تمہاری نظر کے ساتھ

اس وقت بزمِ یار سے ہم کو بھی اے اجل
پروانگی ملی ہے، چراغِ سحر کے ساتھ

یارب یہ ظلم ہم سے تو دیکھا نہ جائے گا
آنکھیں ہوں بند۔ روزنِ دیوار و در کے ساتھ

یاد آگیا ہے صبحِ شبِ وصل کا سماں
جاتی ہے جان، نالۂ مرغِ سحر کے ساتھ

چھوڑا جب اُس نے ساتھ ہمارا تو ہم کو کیا
اب ساتھ زید کے وہ رہے یا بکر کے ساتھ

تاثیرِ جذبِ دل میں نہ تھی خوش سلیقگی
خط، دیکھتے ہی آگئے وہ نامہ بر کے ساتھ

میں، دیکھ لوں گا اُن کو جنھیں دیکھتا ہے تو
میری نظر بھی رہتی ہے تیری نظر کے ساتھ

کچھ مانگنے کو میں نے اٹھائے نہیں ہیں ہاتھ
کہتا ہوں خیر باد دعا کو اثر کے ساتھ

مجھ کو خبر نہیں مجھے کس کی تلاش ہے
ہوں راہزن کے ساتھ کبھی راہبر کے ساتھ

طوفانِ اشک نے، نہ نکلنے دیا ہمیں
بیٹھا ہے گھر تو بیٹھے ہیں ہم اپنے گھر کے ساتھ

(مشاعرہ ۱۳۲۵ء) (ق)

کیفی! وہ رات بھر کے نشے ہو گئے ہرن
دل اپنا بجھ گیا ہے چراغِ سحر کے ساتھ

ی

(سنہ ۱۳۱۷ء سے ۱۳۲۷ء تک)

کی ہے کچھ تقلید اندازِ خرامِ یار کی
چال خود بتلا رہی ہے چرخِ کج رفتار کی

رو کشِ خلدِ بریں دیوار و بامِ یار کی
چشمِ تر تفسیر تجری تحتہا الانہار کی

طالبِ جنت ہو وہ آوارہ یارب کس طرح
جو نہ لے منت کسی کے سایۂ دیوار کی

تم کھلے بندوں پھرو اور ہم مقید ہی رہیں
واہ کیا اچھی ہوئیں پابندیاں اقرار کی

فرط رسوائی میں یک گونہ مزا ملنے لگا
چھیڑ کر کھانے لگے ہم گالیاں بازار کی

ہم صفیران عدم سوتے ہیں کیا آرام سے
کتنی ٹھنڈی چھاؤں ہے قاتل تری تلوار کی

ہائے اب بھی پانو سے مہندی نہیں چھٹتی غضب
یاں تو نبضیں چھٹ گئیں ظالم ترے بیمار کی

پنجۂ وحشت کے ناخن بڑھ گئے آئی بہار
دھجیاں اڑنے لگیں پھر زخم دامن دار کی

گوش ہیں دیوار و در کو رشک سے منھ بند ہے
داستاں کس کو سناؤں اشتیاق یار کی

دل یہ کہتا ہے کہ "ذکر العیش نصف العیش ہے"
عقل کہتی ہے کہ "اس کی آرزو بے کار کی"

انقلاب دہر جاتا ہے کنواں پیاسوں کے پاس
آبلوں کو جستجو ہے وادیٔ پرخار کی

بخش دیتا ہوں میں اُس کو اپنی آنکھوں کا نور
طرح ڈالی جس نے یارب احسن کے بازار کی

وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولے جاتے رہے
ہائے کیفیؔ! کیا کہیں طاقت نہیں گفتار کی

مشاعرۂ بزم زنداں — ۱۵ محرم ۱۳۲۰ھ (ق)

ہر اک سے مل کے رہتی ہے الگ طرز بیاں میری
اکیلی پھرتی ہے بتیس دانتوں میں زباں میری

کہاں ایسا مقدر باریابی ہو وہاں میری
وہ آئیں میرے گھر اتنی بڑی قسمت کہاں میری

زبان زد مثل عنقا ہو گئی ہے داستاں میری
کہاں پہنچائیں وحشت نے اڑا کر دھجیاں میری

فقط اک شغل بے کاری ہے فریاد و فغاں میری
نہ مانا ہے نہ مانے گا کبھی یہ آسماں میری

عدو کا روز روشن تیرہ و تاریک ہو جائے
زمانے میں ہوا باندھے جو آہوں کا دھواں میری

جواب خط میں چکنی چپڑی باتیں اس نے لکھی ہیں
الٰہی! آج تو گھی میں ہیں پانچوں انگلیاں میری

زبان حال سے کہتا ہے گل گلچیں کے دامن میں
کرے گا جستجو کیا کیا چمن میں باغباں میری

تو افسردہ نہ ہو اے آتش گل! پھونک دے اس کو
بسر ہو جائے گی کچھ دن یہی بے آشیاں میری

کوئی پرسان حال اپنا نہیں لیکن خدا رکھے
فقط اک کس مپرسی رہ گئی ہے قدرداں میری

رہے قسمت بگڑ کر بھی بن آتی ہے عجب صورت
شکست رنگ نے رخ سے ہیں عیاں رنگینیاں میری

نہ ہو جاؤں کہیں آزاد دشمن کی اسیری سے
الٰہی کٹ نہ جائیں اپنے دل کی بیڑیاں میری

در زنداں سے باہر کب ہوئیں اس ناتوانی پر
عجب کچھ وضع کی پابند ہیں پرچھائیاں میری

ترقی ہوتی ہے جس وقت میں پہلو بدلتا ہوں
بنی ہیں نردبان درد دل یہ پسلیاں میری

میں وہ بے تاب ہوں مجھ کو کہیں پایا نہ بجلی نے
بہت کی جستجو گرد و نواح آشیاں میری

کچھ اس نے یاد کر لی ہے کچھ اُس نے یاد کر لی ہے
ہوئی ہے جا بجا سے ٹکڑے ٹکڑے داستاں میری

سوال بوسۂ لب کیوں نہ ہو جب تلخ کامی ہے
نہ اس قابل دہن میرا نہ اُس قابل زباں میری

وہی سنتا ہوں جب سنتا ہوں میں عاشق مزاجوں سے
مگر یاروں کو ازبر ہو گئی ہے داستاں میری

الٰہی! میری خاموشی میں دے تاثیر گویائی
خوشامد کرتے کرتے تھک گئی اب تو زباں میری

سنائی کچھ نہیں دیتا کسی کو ہے وہ ہنگامہ
نئے پہلو سے میرا پردہ رکھتی ہے فغاں میری

فدائے شاہد و ساقی کروں کا حشر تک کیفیؔ!
اگر مجھ کو ملے سو بار عمر رائیگاں میری

(مشاعرۂ سالگرہ سی و نہم حضرت غفران مکاں بابتہ ۱۳۲۲ھ) ق

اگر نکلے غبار آمیز آہِ آتشیں اپنی
زمیں سمجھے فلک اپنا فلک سمجھے زمیں اپنی

سمجھ میں آ گیا وحشت ہوئی جب ہم قریں اپنی
فلک اپنا نہ اپنا تھا نہ اپنی تھی زمیں اپنی

دہن سے پھول برساتی ہے آہ آتشیں اپنی
فلک بھر لے گا دامن گود بھر لے گی زمیں اپنی

تصوّر سے غش آتا ہے قیامت تو قیامت ہے
وہاں کیا حشر ہوگا جب یہ حالت ہے یہیں اپنی

بڑے مقتل میں آئے ہو ذرا سیدھے تو ہو جاؤ
سنبھالو اپنے دامن کو، چڑھا لو آستیں اپنی

الٰہی! جلد آنکھیں بند ہو جائیں تو اچھا ہے
کسی کے دل میں کھٹکے گی نگاہ واپسیں اپنی

تری خاطر سے غیروں کی بھی خاطرداریاں کرتے
طبیعت گر نہ ہوتی اس قدر رشک آفریں اپنی

جنوں میں لٹ گئے ہم اب تو خالی ہاتھ بیٹھے ہیں
ہوئی پیوند دامان بیاباں آستیں اپنی

محبت کس طرح نبھتی ہے آئندہ خدا معلوم
نبھی جاتی ہے اب تک تو بآئین ہمیں اپنی

تمھارا دل بڑھانے کے لیے تعریف کرتے ہیں
مگر کیا بے اثر نکلی صدائے آفریں اپنی

عیاں ہے آنکھ کے پردوں سے شعلوں کی جھلک یارو!
چراغ زیرِ داماں ہے کہ آہِ آتشیں اپنی؟

سرمست

سر آنکھوں پر جگہ دیتا ہوں کیفی دخترِ رز کو
یہی ہے نازنیں اپنی، یہی ہے حورِ عیں اپنی

سفارش کے لیے کیفی! کہیں کیا شرم آتی ہے
خطائیں بخشوائیں گے کسی سے کچھ ہمیں اپنی

(ق)

اردوئے معلی م ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء

کس کے دل میں کھپ گئی؟ کس کی نظر میں جچ گئی
میرے دل سی شئے خدا معلوم کس کو پچ گئی

ہنستے ہنستے ہاتھ اس نے اپنے منھ پر رکھ لیا
آسماں سے آج بجلی گرتے گرتے بچ گئی

لے گئی سارے حواس اب نقدِ جاں پر دانت ہے
عرش تک آہِ رسا کب میری بے لالچ گئی

خونِ عاشق ہو کہ رنگِ بے وفائی ہو مگر
چشمِ بد دور آپ کے ہاتھوں میں مہندی رچ گئی

دل کے جانے پر یہ زور و شورِ فریاد و فغاں
بات اتنی سی تھی اس کی دھوم اتنی مچ گئی

پیش قدمی کرکے اس ظالم سے ملتے ہی بنی
ہاتھ کیا آیا بگڑ کر بات کی بھی پچ گئی

تیز و تند و تلخ و دیرینہ شرابِ آتشیں
میرے ساقی نے مجھے جتنی پلائی پچ گئی

اب تو مے خانے میں کیفی! ایک سناٹا سا ہے
وہ جھمیلا مے کشوں کا اور وہ کچ پچ گئی

صحیفہ جلد (۴)، نمبر (۲) (بابتہ دہم شوال ۱۳۲۶ھ) ۱۳۱۸ف

ے

(۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۷ھ تک)

منظور ہو نظارہ جس کو وہ آئے جھانکے
روزن ہیں میرے دل میں دیوارِ لامکاں کے

بوسے ہزار لیں گے ہم سنگِ آستاں کے
ہیں خارِ چشمِ دشمن گل چشمِ پاسباں کے

اب بھی یہ حوصلے ہیں دل خستہ کی فغاں کے
ہل جاتے ہیں زمیں سے قلابے آسماں کے

نظارہ سوز آنسو ہیں چشمِ خوں فشاں کے
شعلے بھڑک رہے ہیں کیا سوزشِ نہاں کے

چبھتے ہیں حرف دل میں فرقت کی داستاں کے
گویا بچھے ہوئے ہیں کانٹے مری زباں کے

قلب و جگر کے چھالے اور آبلے زباں کے
زینے بنے ہوئے ہیں کیا آہِ ناتواں کے

گردش نے روئی رکھی کانوں میں آسماں کے
ڈنکے بجے ہوئے ہیں کیا اوری فغاں کے

خود رفتگانِ الفت کیا اونچ نیچ دیکھیں
ذرّے ہیں یہ زمیں کے تارے ہیں آسماں کے

درست

بربادی چمن پر کس وقت رحم آیا
ای برق! چار تنکے تھے میرے آشیاں کے

زخم جگر کی لذت کم ہو نہ تا قیامت
حق نمک ہیں باقی ان کے لب و دہاں کے

کیوں کر ہو غمگساری غمخوار کی الٰہی!
ظاہر ہی درد میرا چہرے سے رازداں کے

وہ ہم کو یاد کرتے پھر ہم کو چین آتا
فقرے گھڑے ہوئے ہیں یہ اپنے رازداں کے

پیوند خاک ہو کر ننگ زمیں نہ ہوتے
کاش اپنی قبر ہوتی چکر میں آسماں کے

ہوں اول اور آخر بانگ جرس کی مانند
دیکھو تو فی الحقیقت ہوں ساتھ کارواں کے

ای دست شوق! ناخن لے ہوش کے یہ کیا ہی
محجوب کہنگی سے پردے ہیں آسماں کے

مشاعرہ بزم رندان

کیفی! جو میکدے میں رہنا مدام چاہو
یا کر رکھو مغاں کو یا ہو رہو مغاں کے

بابتہ ۱۳۲۱ھ

تھم تھم کے ٹپکتا ہی مرے دیدۂ تر سے
آتا ہی لہو دل میں جو رس رس کے جگر سے

شکوہ ہی ہمیں اپنی محبت کی نظر سے
منھ پھیر لیا اُس نے جدھر ہم تھے اُدھر سے

زخمی ہی جو دل ناوک دل دوز نظر سے
مرہم بھی لگاتا ہوں تو میں تیر کے پر سے

کچھ زور سے ہوتا ہی نہ زاری سے نہ زر سے
دیکھوں کہ نہ دیکھوں تجھے حسرت کی نظر سے

تم غیر کو دیکھو جو محبت کی نظر سے
تڑپے کہ نہ تڑپے کوئی ترسے کہ نہ ترسے

پھر زخم لگا دل پہ مرے زخم جہاں تھا
مارا وہیں کافر نے اُسی تیر نظر سے

اشکوں کا تلاطم کہیں دل کو نہ ڈبو دے
اللہ بچائے مری کشتی کو بھنور سے

آئینے میں شکل اپنی نہ پہچان سکو گے
دیکھو گے اگر دیکھنے والوں کی نظر سے

کیا دوں میں جواب ان کو وہ یہ پوچھ رہی ہیں
"راتوں کو کہاں جاتے ہو چھپ چھپ کے ادھر سے"

غیروں کو محبت کی نگاہوں سے نہ دیکھو
تم آپ نہ گر جاؤ کہیں اپنی نظر سے

جو دل پہ گزرتی ہی وہ میں کہہ نہیں سکتا
جس وقت گزرتا ہوں تری راہگزر سے

سوچو تو ذرا دیکھنے والا ہی تمھارا
تم دیکھتے ہو کس کو حقارت کی نظر سے

عہ مصنف رحمہ نے اس پر ایک اور مصرع بھی لگایا ہے ع معشوق ملا کرتے ہیں الفت کی نظر سے ۱۲ جامع

سرست

ہیں جلوہ گہِ جوششِ رحمت ہیں گنہ گار | پردہ درِ توبہ کا بنا دامنِ تر سے
اے دستِ جنوں! ہاتھ سے یہ وقت نہ ٹل جائے | تو سیکھ لے یہ چاکِ گریبانِ سحر سے
لے لوں گا میں واعظ! اتری دستار ہائی | اک تار بھی کم ہو جو مرے دامنِ تر سے
جب ہوگی قیامت ترے کوچہ ہی میں ہوگی | فتنہ جو اُٹھے گا وہ اُٹھے گا ترے گھر سے
مارا بھی تو مارا مجھے اک تیرِ ہوائی | دیکھا بھی تو دیکھا غلط انداز نظر سے
دن رات تو فرصت کبھی ہوتی نہیں تم کو | ملنے کا جدا وقت ہی کیا شام و سحر سے!
پھر جائے گا پانی ترے اعمال پہ زاہد! | قطرہ بھی جو ٹپکے گا مرے دامنِ تر سے
بڑبول ہو تم کیا کہوں کچھ کہہ نہیں سکتا | اس وقت میں خاموش ہوں اللہ کے ڈر سے
کس منھ سے دعا وصل کی مانگوں شبِ ہجر؟ | مطلب بھی تو ملتا نہیں اب لفظ اثر سے
دل پر ترے کیفی کے بُری چوٹ لگی ہے (بابتہ ۱۴ رجب ۱۳۲۲ھ)
ق
سینک اس کو مرے پیرِ مغاں آتشِ تر سے

مشاعرہ عرس حضرت فیض حیدرآبادی

جلوہ ترا اسیرِ طلسمِ خیال ہے | اور اس کی اب وہاں سے رہائی محال ہے
لب بند ہیں کہ بندِ زبانِ سوال ہے | یہ منّتِ حلاوتِ حسنِ مقال ہے
ہم سے نہ بولے کوئی تو ہم کیوں جواب دیں؟ | صورت اگرچہ روئے سخن کی سوال ہے
اچھا ہی یہ لگاڑ کہ چھوٹا میں رشک سے | خوش ہوں کہ اُن کو صرف مجھی سے سوال ہے
عاشق خود اپنے حسنِ طلب کا ہے یہ فقیر | تم سے سوال ہے نہ کسی سے سوال ہے
یہ انتظارِ وعدۂ فردا اسے کھل گیا | بے شبہہ اُن کی چال قیامت کی چال ہے
کہتا ہوں "کچھ کہو" تو وہ کہتے ہیں "کیا کہوں؟" | عذرِ جواب یار بھی اُلٹا سوال ہے
شرمندہ روا ہے نہ منتِ کشِ دعا | ناگفتہ بہ مریضِ محبت کا حال ہے
پاتا ہے دل سے کیا صلہ لذتِ خلش | ہر خار گلستانِ محبت نہال ہے
مشکل وہ کون سی ہے جو آسان ہو سکی | دشواریوں کا سہل نہ ہونا محال ہے

حسرت

مجبور ہوں وگرنہ دعا بھی نہ مانگتا
کیا بے محل تبسم سیں سوال ہے

وہ خواب میں ملے بھی تو منھ ڈھانک کر ملے
(مشاعرہ حضرت فیض) کتنا دراز دامنِ گردِ ملال ہے (بابتہ ۱۳۲۳ھ) ق

کسی پر جان جاتی ہے کسی پر دل تصدق ہے
گئے وہ دن کہ ہم کہتے تھے "بندہ بے تعلق ہے"

بھلا کیا قبر میں لے جاؤں گا میں جان اے قاتل!
یہ تیرے ہی لیے ہے اور یہ تجھ پر ہی تصدق ہے

نہ پریوں کی تمنا ہے نہ خواہش حورِ جنت کی
تمھارے ہو چکے ہم اب کسی سے کیا تعلق ہے

کبھی جن کو کسی سے بات کرتے شان لگتی تھی
خدا کی شان اب ان کی زباں محوِ تملق ہے

طریقِ عشق میں کیفی کہاں کی عاقبت بینی
(صحیفہ جلد ۱ نمبر ۵) امورِ مملکت میں حاجتِ غور و تعمق ہے (بابتہ شعبان ۱۳۲۳ھ)

تمھیں فرصت نہیں اٹھا بہانہ ایک یہ بھی ہے
زمانہ ایک وہ بھی تھا زمانہ ایک یہ بھی ہے

ملا کر دفترِ غم اپنا قصوں کی کتابوں میں
ہم ان سے کہتے ہیں افسانہ ایک یہ بھی ہے

ہوئی کیا ہم صفیرانِ چمن کی خانہ بربادی
بھڑکا ہی آتشِ گل! آشیانہ ایک یہ بھی ہے

مے و معشوق کا روزانہ جلسہ ایک وہ بھی تھا
ہمیں ہیں ہم ہیں فقط بزمِ شبانہ ایک یہ بھی ہے

انھیں بے حد شکایت ہے مری نازک مزاجی کی
(صحیفہ جلد ۱ نمبر ۷) کہ فرماتے ہیں "طرزِ عاشقانہ ایک یہ بھی ہے" (بابتہ شوال ۱۳۲۳ھ)

وسعت مآل خانہ خرابی نظر میں ہے
صحرائے لق و دق مرے چھوٹے سے گھر میں ہے

گنجائش کلام کہاں خیر و شر میں ہے
جب تم بشر نہیں ہو تو سبھی کچھ بشر میں ہے

یوں تو ذلیل و خوار ہر اک کی نظر میں ہے
بندے کی شان چشمِ حقیقت نگر میں ہے

کچھ رنگ انقلاب تمھاری نظر میں ہے
اب دل میں وہ خلش ہے نہ کاوش جگر میں ہے

کیا دیکھتا ہوں رات کو میں خواب میں کہ ہائے
اک ہاتھ ہی گلے میں ترے اک کمر میں ہے

کس دل جلے کا ڈھیر ہے یارب! تری پناہ
اس راکھ میں شرر ہے جہنم شرر میں ہے

کوشش ہی دامنِ پرِ پروانہ کی عبث ؎ مصروف کیوں حفاظتِ شمعِ سحر میں ہی
کس طرح کچھ کہوں شبِ تارِ فراق سے ؎ مشغول وہ تو بخیۂ چاکِ سحر میں ہی
بندہ بشر ہی عفوِ خطا کا امیدوار ؎ بے بس معاملاتِ قضا و قدر میں ہی
غمخوار بن گئے ہیں چھڑکتے تھے جو نمک ؎ کچھ ایسی چاشنی مرے زخمِ جگر میں ہی
کی ہم نے معصیت بھی سلیقے سے دیکھ لو ؎ توبہ کی بھی شکن کوئی دامانِ تر میں ہی؟
دیوانہ پن مرا ترے جلوے سے کم نہیں ؎ یوں بھی تو ایک بھیڑ تری رہگزر میں ہی
دنیا تمام پھر گئی دل تو نہیں پھرا؟ ؎ پہلے جو تھا وہی تو ہماری نظر میں ہی
میں جانتا ہوں اب وہ مری عزت آبرو ؎ میری نظر میں ہی نہ تمھاری نظر میں ہی
اڑتی تھی آنکھ اب نہیں ملتی نگاہ تک ؎ وہ بھی نظر میں ہی مری یہ بھی نظر میں ہی
واعظ! یہ اپنی اپنی نگہ ہی کہ حورِ خلد ؎ تیری نظر میں کچھ ہی کچھ اپنی نظر میں ہی
پوچھو کلیم ہم سے جمال و جلالِ یار ؎ تشخیص نور و نار ہماری نظر میں ہی
یہ جنگ زرگری مری آنکھوں سے دیکھنا ؎ دل میں ملاپ اور لڑائی نظر میں ہی
دل اک نگاہ ناز میں لیتے نہیں تو خیر ؎ کتنے کا مال پھر یہ تمھاری نظر میں ہی؟
ارض و سما ہی وقفِ نگاہِ امید و یاس ؎ دنیا کی نیچ اونچ ہماری نظر میں ہی

(ق)
کیفی ہی سو بر دل کا برا پھر بھی سچ کہو
ایسا بھی کوئی شخص تمھاری نظر میں ہی؟
(اردوئے معلی ۱۹۰۵ء / ۱۳۲۳ھ)

مجھ سخت جاں سے قاتل! کیا کیا گزند پہنچے ؎ شل ہو گئے ہیں بازو ہیں دردمند پہنچے
پہنچائے رنج تم نے جتنے عدو کی خاطر ؎ ہم کو بلا تامل اُس سے دوچند پہنچے
مطرب نے کان جس کے کچھ کہہ کے بھر دیے ہو ؎ اے پندگو! وہاں کیا آوازِ پند پہنچے
میرے سبب سے یارب! نقصاں نہ ہو کسی کا ؎ دشمن کو بھی نہ مجھ سے کوئی گزند پہنچے
یادش بخیر جن کا یہ ذکر ہو رہا تھا! ؎ وہ خود پرست آئے وہ خود پسند پہنچے

پرست

تاثیر کچھ دکھائے آہِ دلِ شکستہ — تا بامِ یار۔ یارب! ٹوٹی کمند پہنچے

اک ہم وہاں نہ پہنچے۔ کم قسمتی ہماری — کم بخت سب رقیب، بخت ارجمند پہنچے

کیا تیز رو ہے اپنی عمرِ رواں کا توسن — کب گرد کو بھی اُس کی کوئی سمند پہنچے

دُنیا سے سب برابر نکلے مگر عدم میں — خرسند بعض پہنچے بعضے نژند پہنچے

سینے میں جس کے دل ہو اور اس میں کچھ خلش ہو — اس درد کو ہمارے وہ دردمند پہنچے

دل سے لبوں تک آئے نالے تو ہم یہ سمجھے — عرشِ بلند سے بھی گز بھر بلند پہنچے

دربار، اور اُن کا، پھر اپنی باریابی؟ — کیا جانے کیا سمجھ کر ہم مستمند پہنچے

ہیں میرے دل کے ٹکڑے بھرپائی کی رسیدیں — پہنچائے تم نے جتنے اُتنے گزند پہنچے

بیٹھے ہیں آج کیفی مسجد میں لے کے تسبیح
ایسے میں کاش کوئی زنار بند پہنچے

(صحیفہ جلد ۲ نمبر ۵) (بابتہ محرم ۱۳۲۵ھ)

تبسم لب پہ، خنجر ہاتھ میں، آنکھوں میں مستی ہے — وہ محوِ ناز آئینے میں محوِ خود پرستی ہے

بلا ہے نیچی نگہ، وہ جان بھی لے کر تو سستی ہے — سُنا ہے "قیمتی ہوتی ہے جو تلوار کستی ہے"

محیطِ عرش و فرش اک حضرتِ انساں کی ہستی ہے — کوئی ایسی بلندی ہے نہ کوئی ایسی پستی ہے

ہزاروں نعمتوں کی ایک نعمت تندرستی ہے — مگر آگے ترے بیمار کے کیا اس کی ہستی ہے

مدینہ جس کو کہتے ہیں وہ جانِ ملکِ ہستی ہے — جہاں ہر بار ہر دم رحمتِ باری برستی ہے

جسے تم چاہو آنے دو جسے چاہو نہ آنے دو — تمھارا گھر ہے میں کیوں کر کہوں اُجڑی ہوئی بستی ہے

پریشانوں کا مسکن اور غمگینوں کا ہے مامن — ترا کوچہ تو کیا اک خانہ بر دوشوں کی بستی ہے

مرے ناکردنی اعمال ہیں ناقابلِ پرسش — الٰہی! میں ہوں کتنا آدمی؟ کیا میری ہستی ہے

ملا کر آنکھ دل لے لیتے ہیں وہ کس صفائی سے — نگاہوں میں کسی عیار کی چالاک دستی ہے

خبر لیتے نہیں تم اپنے بیمارِ محبت کی — بجائے اشک اب آنکھوں سے مایوسی برستی ہے

متاعِ دل کی قیمت واجبی جو ہو وہ دو کہہ دو — "کہ اتنے میں یہ مہنگی اور اتنے میں یہ سستی ہے"

سرمست

نشاں اس کا مٹادو ہڈیاں کھدوا کے پھکوا دو — مزارِ عاشقِ ناشاد پر عبرت برستی ہے

جگہ کیفیؔ اگر تیری ہو چشمِ مستِ ساقی میں

(مشاعرہ حضرت فیضؔ) (رجب ۱۳۲۵ھ)

تو پھر کچھ ذوقِ مستی اور لطفِ مے پرستی ہے

ق

وہاں تو دل جلانے کے لیے اعجاز ہوتا ہے — یہاں اپنی وفا پر مجھ کو کیا کیا ناز ہوتا ہے

نہ وعدہ کیجیے ایسے خدارا ہم سے ملنے کا — مزاج اکثر اسی دن آپ کا ناساز ہوتا ہے

گنہ گار، اور پھر مجھ سا، خدائی میں نہیں کوئی — وہ عاصی ہوں کہ مجھ پر مغفرت کو ناز ہوتا ہے

عجب کچھ گو مگو ہے داستانِ عشق بھی یارب! — نہ مخفی بات رہتی ہے نہ افشا راز ہوتا ہے

سمجھتے ہیں ہمیں کچھ آپ کی طرزِ عبارت کو — عجب انداز سے مطلب علم انداز ہوتا ہے

نگہ ملتے ہی ہم سے مردہ دل بھی بول اٹھتے ہیں — مگر جادو بھری آنکھوں میں بھی اعجاز ہوتا ہے

جنابِ حافظ شیرازؒ کا پیرو ہوں میں کیفیؔ!

(صحیفہ جلد ۳ نمبر ۶) (بابتہ صفر ۱۳۲۶ھ)

مرے شعروں میں کیفِ بادۂ شیراز ہوتا ہے

خوش چشم جو روش بھی ہے وہ خوش نظر بھی ہے — آنکھوں میں سحر، اور نظر میں اثر بھی ہے

سرخیِ اشک، زردیِ رخ کا علاج کیا — اے چارہ گر! اس بنت کی تجھ کو خبر بھی ہے

دل ترکِ آرزو پہ ہو آمادہ کس طرح — اس کو تو پاسِ خاطرِ درد جگر بھی ہے

ذلت کے ساتھ ساتھ ہی عزت بھی عشق میں — یہ عیب کا ہی عیب ہنر کا ہنر بھی ہے

عزلت نشینِ کوئے ملامت سے ہر طرح — آسائشِ وطن بھی ہے لطفِ سفر بھی ہے

کیفیؔ! بلا رہا ہے انھیں تو جو اپنے گھر

(صحیفہ جلد ۳ نمبر ۸) (بابتہ ربیع الآخر ۱۳۲۶ھ)

اے خانماں خراب! کہیں تیرا گھر بھی ہے؟

فکرِ معاد ہے نہ تلاشِ معاش ہے — کھویا گیا ہوں میں مجھے اپنی تلاش ہے

تصویر میں ادا ہے ادا بھی نظر فریب — میں جانتا ہوں یہ بھی انھیں کی تراش ہے

مجھ کو ہے یہ خیال کہ میں ہوں وبالِ دوش — وہ یہ سمجھتے ہیں مرے کشتے کی لاش ہے

بزمِ عدو میں وہ مری چپ سے ہیں بے قرار — یہ آہِ بے صدا بھی عجب دل خراش ہے
اللہ رے ہجومِ تمنا کی آفتیں — دل پارہ پارہ اور جگر پاش پاش ہے
کھل کھیلتی ہے میری محبت بھری نگاہ — اب اک ذرا سی آن میں سب راز فاش ہے
کیفی کے حال سے ابھی واقف کہاں ہیں آپ — بابتہ جمادی الاول و آخر سنہ ۱۳۲۹
صحیفہ جلد ۳ نمبر ۹ و ۱۰ — ہم خوب جانتے ہیں بڑا بدمعاش ہے

لب پہ تعریف تری آئی ہے — مجھ پہ شیدا مری گویائی ہے
دست گستاخ ہیں اور فہمائش — وہ جو بگڑے ہیں تو بن آئی ہے
ہوتی ہے دل کی تڑپ سے تسکیں — بے قراری ہیں شکیبائی ہے
وہ مرے دل سے نکلتا ہی نہیں — لوگ کہتے ہیں کہ ہرجائی ہے
ہر جگہ ہیں ترے جلوے روشن — پھر یہ یکتائی کی یکتائی ہے
سامنے سے نہ ہٹے یہ تصویر — جب تک اس آنکھ میں بینائی ہے
ہو کا میدان بھی اللہ اللہ — نہ تماشا۔ نہ تماشائی ہے
دیکھ او نیچی نگاہوں والے! — آنکھ کس سے تری شرمائی ہے
پھر وہی دن ہیں وہی راتیں ہیں — پھر وہی عالمِ تنہائی ہے
تیری مشتاق ہیں میری آنکھیں — دل مرا۔ تیرا تمنائی ہے
دے حیاتِ ابدی کشتوں کو — یہ بھی اک طرزِ مسیحائی ہے
اس جگہ کوئی نہ آنے پائے — پاس میرے۔ مری تنہائی ہے
ٹانچ لے جلد ذرا سی کیفی — (۲۴ رجب سنہ ۱۳۲۶)
شاعرہ حضرت فیض ۲۷ — تاک میں گنبدِ مینائی ہے — ق

اپنے سائے سے جھجکتے تھے جو پہلے پہلے — ساتھ غیروں کے وہ اب پھرتے ہیں اہلے گہلے
آپ کی راہ میں کب تک کوئی بے چین رہے — سانس آخر مرے سینے میں کہاں تک ٹہلے
جی کڑا کر کے رکھو صحنِ گلستاں میں قدم — دل نہ غنچوں کے چٹکنے کی صدا سے دہلے

سرمست

دم نکلتا ہی کہیں ہم سے گراں جانوں کا
روز ہوتے ہیں پیکِ قضا کے ڈھلے

دلِ نا عاقبت اندیش کی خاطر کب تک؟
ہم وہاں اب سے نہ جائیں گے جہاں جی بہلے

اب نہیں زعم اگر مہر و وفا کا ہی تو ہو
ہم کو کیا اس سے؟ کوئی اپنی جگہ کچھ کہہ لے

یہ ہیں اس کوچے کے آدابِ نشست و برخاست
رات بھر پڑے رہے دروازے پہ دن بھر ٹہلے

(صحیفہ جلد ۴ نمبر ٦)

ترکِ الفت کا ارادہ قصدِ روپوشی بھی ہی
اور پھر دل میں تمنائے ہم آغوشی بھی ہی

خود فروشی ہی نہیں ہی خود فراموشی بھی ہی
آپ کی باتوں میں گویا لطفِ خاموشی بھی ہی

کان میں اک بات سن لو آ تا کہ دشمن تاڑ لیں
فاش گوئی بھی ہی یہ کہنے کو سرگوشی بھی ہی

شیخ صاحب! پی بھی لو اک بار کہہ کر یا غفور
زہد کا ہی زہد می نوشی کی مے نوشی بھی ہی

غیر کی خاطر سے ٹھیری ہی مری گردن زنی
یہ گراں جانی بھی ہی یا رب! سبک دوشی بھی ہی

قلت و کثرت ہی کیفی! بات اپنے ہاتھ کی
مے نشاط افزا بھی ہی داروئے بے ہوشی بھی ہی

(صحیفہ جلد ۴ نمبر ۸)

(ق)

یہ کیسی بر بھی جب سامنے پیمانہ آتا ہی
ترے لب تک مگر پیمانہ گستاخانہ آتا ہی

نزاکت کا برا ہو وہ سنورنے بھی نہیں پاتے
بڑی مشکل سے زلفِ عنبریں تک شانہ آتا ہی

خوشامد، اور پھر اتنی خوشامد! اُس ستمگر کی
تجھے کچھ بھی خیال اے ہمتِ مردانہ آتا ہی؟

نہ پوچھو تم ادا کیا ہی شرارت کس کو کہتے ہیں؟
سکھانے سے کہیں اندازِ معشوقانہ آتا ہی؟

رخِ روشن تمھارا زندگی بخشِ دو عالم ہی
سمندر بن کے رہ جاتا ہی جو پروانہ آتا ہی

تباہی دم بدم معمورۂ عالم کی بڑھتی ہی
کہ میری پیشوائی کے لیے ویرانہ آتا ہی

خدا جانے یہ کس خاک مقدس سے بنا ہو گا
کہ ہاتھوں ہاتھ بزمِ یار میں پیمانہ آتا ہی

شرابِ آتشیں نے پھونک ڈالا تن بدن کیفی!
نظر اپنا سراپا مجھ کو آتش خانہ آتا ہی

لے کے دل منہ پھیرلے ان جان بن کر جان لے
میرا ذمہ ہے اگر تجھ کو کوئی پہچان لے

مسکرا کر میرا دل لے ہنس کے میری جان لے
اُس کو ایسی کیا پڑی ہے جو مرا احسان لے

لاکھ تو پردوں میں چھپ چھپ کر ہماری جان لے
بناتے ہیں کہ ہم بھی تجھ کو تو بھی اتنا جان لے

اب یہ توبہ ہے مگر اب کے تو اتنی مان لے
لے یہ تھوڑی ہی ہے میں قربان میری جان لے!

یہ سماں، یہ چاندنی؟ ای مطرب عاشق نواز!
جی پھڑک جائے ہمارا کوئی ایسی تان لے

تیرے وعدے کا بھروسہ کیا ارے پیماں شکن
اعتبار آتا نہیں سر پر اگر قرآن لے

مار ڈالا مار ڈالا۔ لٹ گئے ہم لٹ گئے!
تان لے پھر تان لے، منہ پر دوپٹہ تان لے!

ہوں اگر ظالم! ترے سب جور پنہاں آشکار
نام بھولے سے محبت کا نہ پھر انسان لے

بات کرنے کا سلیقہ تک نہ آتا تھا جسے
اب ہمیں سے شان کی وہ بت خدا کی شان لے

چھوڑ دے ای دل! خیال خوب رویاں چھوڑ دے
مان لے، نا عاقبت اندیش! میری مان لے

دیکھ **کیفی**! بادۂ دیرینہ دُرد آمیز ہے
ریش قاضی میں ذرا پینے سے پہلے چھان لے

صحیفہ نمبر ۶ جلد ۵

کر کر کے ظلم ہم پر مظلوم آپ ٹھیرے
ایسے سے یاالٰہی! کیوں کر ملاپ ٹھیرے؟

پہلو میں دل جو تڑپا جنگل میں مور ناچا
نالے کیے جو موزوں، بے سُر الاپ ٹھیرے

کیا تیرے بانکپن نے الٹی بہائی گنگا
پُن کے تھے کام اپنے جتنے وہ پاپ ٹھیرے

کیا دے کے لوں میں ساقی تیری مے محبت
کیا اس کا تول ٹھیرے کیا اس کا ناپ ٹھیرے؟

کیا کیا مزے کی آفت کس کس طرح رہی ہے
جس دن ہمارے گھر میں اک رات آپ ٹھیرے

آنکھیں سپید کر دیں یعقوب کی رُلا کر
ای عشق! تو ستائے عاشق جو باپ ٹھیرے

بھٹی کے گھٹّوں میں لذّت نہیں رہی ہے
اپنا مقام **کیفی**! اب کوئی شاپ ٹھیرے

اُردوئے معلی ڈسمبر ۱۹۱۲ء

قسمت معکوس ہو رہی ہے
ساعت منحوس ہو رہی ہے

چادر شب وصل تان لی کیوں؟ | سردی محسوس ہو رہی ہے
مجھ سے اس شوخ کی طبیعت | اب کچھ مانوس ہو رہی ہے
پی پی کے شراب تھک گئے ہم | اب "یا قدوس" ہو رہی ہے
تیری زلف رسا کی شہرت | از چین تا روس ہو رہی ہے
بزم دشمن میں آنکھ میری | مثل جاسوس ہو رہی ہے
پھر اپنی طبیعت اُس پہ مائل | افسوس افسوس ہو رہی ہے

اپنی ہر آہ بت کدے میں
بانگ ناقوس ہو رہی ہے

اُن پہ الزام نہ آے مری ناکامی سے | وہ نہ رسوا ہوں الٰہی! مری بدنامی سے
میں کہوں کچھ یہ کہیں کچھ، وہ سمجھ لیں کچھ اور | بات کرتے ہوے ڈرتا ہوں میں پیغامی سے
مجھ کو اصرار کا موقع نہیں ملنے دیتا | اب وہ کرتا نہیں انکار مے آشامی سے
رشک اغیار سے کی ترک محبت ہم نے | تو وہ سمجھے ہیں کہ ہم ڈر گئے بدنامی سے

ہم سے پوچھے کوئی تعریف جناب **کیفی**
دیکھنے کو تو نظر آتے ہیں اک عامی سے

میری طرح نہ آہ کوئی بے اثر کرے | انسان اپنا کام ہر اک سوچ کر کرے!
رُخ سے نقاب دور جو وہ فتنہ گر کرے | سجدہ ملک، تو جان تصدق بشر کرے
مہمان کی طرح سے نہ آؤ نگاہ میں! | معشوق ہی وہ کیا ہی جو دل میں نہ گھر کرے؟
سو بار آزما کے بھی عاشق سے ہی گریز | اب کوئی تم کو پیار کس امید پر کرے؟
ساقی! جو تیری لذت بخشش ہو عام فہم | توبہ گناہ سے نہ کوئی عمر بھر کرے
سو جان سے فدا ہوں میں اس بے نیاز پر | مجھ سے گناہ گار کو جو در گزر کرے
میں سر سے پانو تک ہمہ تن حرف راز ہوں | میری طرف نہ بھول کے کوئی نظر کرے

دل میں نہاں خیال ہی اک پردہ دار کا
آنکھوں کو کانوں کان نہ کوئی خبر کرے

رکھنے کو دل نے پانو تو رکّھا ہی عشق میں
ہی بات تو جبھی کہ یہ میدان سر کرے

دیکھے تو اُس کی کوئی ملائک فریبیاں
تھوڑا ہی ناز حسن پہ وہ جس قدر کرے

وہ تیر تیر ہی جو کلیجے کے پار ہو
وہ آہ آہ ہی جو دلوں پر اثر کرے

کیا کیا بھری ہی دل میں ہمارے انانیت
شیطان دیکھ پائے تو وہ الحذر کرے

کیسی ڈھٹائیاں ہیں یہ؟ اللہ کی پناہ
کرتے ہیں عیب ہم کوئی جیسے ہنر کرے

ملتی ہی اُس کو منزل آوارگی کی راہ
جو ایک عمر اپنے وطن میں سفر کرے

زاہد صلوٰۃ و صوم پہ یہ عُجب یہ غرور
طاعت ہی کیا ہی وہ؟ جو خدا سے نذر کرے

پائے گا روئے شاہدِ مقصود جلوہ گر
انسان صدقِ دل سے رخ اپنا جدھر کرے

ای مرجعِ محبت عالم! جواب دے!
تجھ سے گلہ کرے تو کوئی کس قدر کرے

آلودگی جامۂ تزویر - کیا کہوں؟
خورشید حشر، خشک نہ دامان تر کرے

دو روزہ زندگی کی خوشی کیا؟ ملال کیا؟
یہ دنیا میں جس طرح سے بسر ہو بسر کرے

دل سے دعا نکلتی ہی کیفیؔ! ترے لیے
اللہ تیرا خاتمہ ایمان پر کرے

ع

اک آگ سی لگی ہوی سب تن بدن میں ہی
سوز و گداز، اس لیے میرے سخن میں ہی

سیر اک جہان کی ہمیں حاصل دکن میں ہی
غربت بھی میہمان ہمارے وطن میں ہی

پہلو میں دل - نہ جان گراں بار یہ تن میں ہی
اپنا تو اک بھرم ہی بھرم پیرہن میں ہی

پروانہ وار، روح اُسی انجمن میں ہی
پھر کس زمیں کا رزق ہمارے کفن میں ہی؟

لطفِ کلام، کب یہ کسی کے سخن میں ہی
اک بات ہی تو ہی جو تمھارے دہن میں ہی

ع یہ غزل اُستاد مرحوم کے انتقال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۲۹ھ کو جناب شیخ یوسف علی صاحب خلوصؔ نے اپنے عمِ محترم مولوی حکیم نوازش علی صاحب مستؔ مرحوم (۱۴ رجب ۱۳۲۲ھ) کے ذخیرہ سے تلاش کر کے دی (جامع)

کعبے میں بھی ہیں شیخ کو دنیا کی رنجشیں
بیت الحرم میں ہے کہ۔ یہ بیت الحزن میں ہے؟

دنیائے نازنیں، ہیں عجب دل فریبیاں
رنگ عروس تازہ اسی پیرزن میں ہے

لوحِ مزار۔ تربتِ شیریں پہ کب ہے یہ
چھاتی پہ اک پہاڑ۔ غم کوہ کن میں ہے

معشوق نازنیں ہے تو، عاشق نیاز کیش
وہ طاق اپنے فن میں۔ یہ طاق اپنے فن میں ہے

سو بار، جاں نثاری کو آمادہ ہیں۔ مگر
اپنی تو جان۔ قبضۂ شمشیر زن میں ہے

لاکھا، جما ہے پان کا۔ ہونٹوں پہ یار کے
یا رنگ سرخ، برگ گل یاسمن میں ہے؟

ہوگا، بتوں کو حشر میں شاید یہی عذاب
دوزخ چھپی ہوی مرے دل کی جلن میں ہے

ساماں کے دیکھ بھال سے ملتی تو ہے نجات
جو راہبر کا وصف ہے وہ راہ زن میں ہے

کیا گو مگو میں تلخ ہماری ہے زندگی
چپ میں ہے کچھ مزہ نہ حلاوت سخن میں ہے

انجم نہیں۔ ہے خون تمنا کی یادداشت
اک اک گرہ، یہ دامنِ چرخ کہن میں ہے

اک وہ ہیں، مرنے والوں سے جو بے نیاز ہیں
اک وہ ہے جو کشاکش دار و رسن میں ہے

ہر پھر کے پڑتی ہے دل تاریک پر نظر
یہ ایک شمع مردہ۔ مری انجمن میں ہے

کس طرح، حلقۂ درِ توبہ۔ ہلا دیا؟
کیا زور ناز۔ ساقی توبہ شکن میں ہے

جز زخم ہائے دل کے، نہیں تازگی کہیں
گویا ہماری سیر، ہمارے چمن میں ہے

رہتی ہیں ارد گرد تری کس مپرسیاں
غربت میں کب ہے لطف جو اپنے وطن میں ہے

وہ، اور مجھ پہ ایسی نوازش، زہے نصیب
کیا آج، کوئی اور مرے پیرہن میں ہے؟

ہے تازگی فریب دو صد گلشن حدوث
جو پھول میرے دامنِ زخم کہن میں ہے

لذت ہے خامشی میں کچھ ایسی۔ کہ لب ہیں بند
گویا زبان یار۔ ہمارے دہن میں ہے

ہر رہ گزر میں فتنۂ خوابیدہ جاگ اٹھے
انداز شور حشر تمہارے چلن میں ہے

اللہ رے، سوز آتشِ پنہاں کی دست برد
بے مغز استخواں ہے جو میرے بدن میں ہے

یہ جان اپنی جان۔ نہ یہ دل ہے اپنا دل
ہم کیا ہیں؟ ایک پیکر مردہ کفن میں ہے

معشوق - اور پھر ہے، وہ عاشق مزاج بھی
کیا سادگی کی شان ترے بانکپن میں ہے

ہم، اپنا حال - کہہ نہیں سکتے کسی طرح
گویا زبان کہنے کو اپنے دہن میں ہے

فریاد میں، صدا بھی نہیں ہے - اثر کہاں؟
ہاں! ہے تو ایک حسرت معنی سخن میں ہے

اغیار، تاب لا نہ سکے جل کے اٹھ گئے
کس سرکشی سے شمع تری انجمن میں ہے؟

سب تجھ کو چاہتے ہیں - مگر حسب حوصلہ
یوسف کی آرزو دل ہر پیرزن میں ہے

پابند شوخیوں نے - مگر کر لیا انھیں
خلوت میں چین ہے نہ قرار انجمن میں ہے

اب ہو گیا ہے کچھ دہن زخم بد مزہ
لذت ہے وہ نمک میں نہ مشک ختن میں ہے

جو ہم نشین خاک سر کوئے یار تھا۔
وہ مشت خاک گلشن حسرت کفن میں ہے

بلبل تری گلی میں ہے گلزار چھوڑ کر
پروانہ بے چراغ مری انجمن میں ہے

میں جانتا ہوں سب کی طرح خود پسند ہوں
کتنا بڑا یہ عیب مرے حسن ظن میں ہے

غربت پسند عشق کی، کیا کیا ہیں سازشیں
یوسف وطن میں ہے نہ زلیخا وطن میں ہے

پاتا ہے دل قرار - تو ہوتا ہوں بے قرار
دیوانے کو - لگا وہی دیوانے پن میں ہے

پروانوں کا ہجوم ہے اطراف داغ دل
گل شمع کا چراغ، مری انجمن میں ہے

بے[1] اختیار ہم سے میں کیا کریں
کچھ بھی نہیں تو دشنہ کف کوہ کن میں ہے

...... پس مرگ تا ہنوز[2]
میں تو نہیں ہوں ہاں مرا دھوکا کفن میں ہے

کیفی! نیا نیا ہے مرا شوق مے کشی
نیت، مگر ابھی سے شراب کہن میں ہے

پوچھو نہ حال کیفی خانہ خراب کا
(ق)
مہمان گھر میں اور مسافر وطن میں ہے

ابھی تک چشم گریاں میں نمی ہے
طبیعت تھمتے تھمتے ہی تھمی ہے

---

[1] نوشتے سے پڑھا نہیں گیا تو صورت نویسی کر دی گئی [2] کاغذ سے لفظ ہی مٹ گئے (جامع)

بلا جانے گرفتارِ بلا کی
کہاں کا عیش کیسی خرمی ہے

خدا رکھے پریشاں خاطری کو
ہمیں حاصل نشاطِ برہمی ہے

گئی اپنی جوانی ساتھ دل کے
فقط اب جان جانے کی کمی ہے

بُرائی اور پھر میری بُرائی
جمی ہے دل میں اور اُن کے جمی ہے

ہنسی آتی ہے غمخواروں پہ اپنے
عجب شادی نُما اپنی غمی ہے

وہ بن کر آئے ہیں میرے عزادار
محرم کا لباس ماتمی ہے

چھپاتے ہیں مجھی سے راز میرا
یہ کیا اچھا ثبوتِ محرمی ہے

بہت کچھ شیخ نے پھر کی ہے توبہ
مگر بندہ بشر ہے آدمی ہے

بہت جی خوش ہوا کیفی سے مل کر
بہت سی خوبیوں کا آدمی ہے

ملے کیفی کو ساقی احمدی جام (ق)
مشائخ، پیرزادہ ہاشمی ہے

میں کہتا ہوں "اُسے" تو میری جاں ہے"
وہ کہتا ہے کہ "یہ میری زباں ہے"

اِدھر ہم اور فریاد و فغاں ہے
اُدھر وہ اور کچھ ہوں ہے نہ ہاں ہے

یہ ہم ہیں یا ہمارا اک گماں ہے
عیاں جس کو سمجھتے ہیں نہاں ہے

نہ اب وہ ذوقِ آزار و فغاں ہے
نہ وہ نامہرباں نامہرباں ہے

مرا شیون ہے بلبل کی فغاں ہے
یہ اپنا اپنا اندازِ بیاں ہے

نہاں سینے میں عشقِ گل رخاں ہے
گلابی اپنی آہوں کا دھواں ہے

خلش افزا مری طرزِ بیاں ہے
دہن اک زخم ہے، کانٹا زباں ہے

عجب کچھ گومگو اس کا بیاں ہے
نہیں سمجھو، نہیں۔ ہاں سمجھو ہاں ہے

پتا چلتا ہے اتنا زاہدوں سے
اِرم خانہ بدوشوں کا مکاں ہے

کچھ اس کے جھک کے ملنے میں بھی ہے فی
کہ آخر آسماں پھر آسماں ہے

نظر بازوں کو کر دیتی ہیں سرشار — یہ آنکھیں کس شرابی کی دکاں ہی
انھیں آمادہ کرتے ہیں جفا پر — ہمیں منظور اپنا امتحاں ہی
اسیری نے کیا ہی سب سے آزاد — مجھے صیاد کا گھر آشیاں ہی
مرے حق میں ستمگر! مشورہ گر — بڑا بوڑھا پرانا آسماں ہی
نہیں پھرتا ہی گاہک کوئی محروم — عجب چلتی ہوی تیری دکاں ہی
تمھاری شوخیوں میں ڈھونڈھتا ہوں — کہ میرے دل کی بے تابی کہاں ہی؟
کہوں کیا سرگزشت اپنی کسی سے — کہ اِک اِک بات اِک اِک داستاں ہی
بڑھی یہ خانہ ویرانی سے وقعت — کہ جو میرا مکاں ہی لامکاں ہی
گرے گی سب سے پہلے اس پہ بجلی — کہ اونچا سب سے جس کا آشیاں ہی
تجھے میں اپنے دل میں ڈھونڈھتا ہوں — ذرا کہہ دے کہ "میرا دل کہاں ہی؟"

فقیروں میں ہی کیفیؔ شیخ کامل
تو رندوں میں بڑا پیر مغاں ہی

---

۱ کی ہر کچھ تقلید انداز خرام یار کی — چال خود بتلا رہی ہے چرخ کج رفتار کی

۲ روکش خلد بریں دیوار و بام یار کی — چشم تر تفسیر تجری تحتہا الانہار کی

۳ طالب جنت ہو وہ آوارہ یار کبھی — جو نہ لے منت کبھی سایۂ دیوار کی

۴ ہم کہیں بند و گیر و دار ہم مقید ہی رہے — واہ کیا اچھی ہوئی پابندیاں اقرار کی

۵ فرط رسوائی نے آگو نہ مزا ملنے لگا — جس پہ ارزانی لگے ہم گالیاں بازار کی

۶ ہم صفیران عدم سوتے ہیں کیا آرام سے — کتنی ٹھنڈی چھاؤں ہے قاتل تری تلوار کی

۷ ہاں رہی پاؤں سے مہندی نہیں چھٹتی غضب — یا تو نبضیں چھٹیں ظالم تری بیمار کی

۸ پنجہ وحشت کے ناخن بڑھ گئے آئی بہار — دھجیاں اڑنے لگیں پھر زخم دامن دار کی

۹ گوش ہیں دیوار و در کو رنگ سے مند تہہ ہے — داستاں کس کو سناؤں اشتیاق یار کی

۱۰ دل یہ کہتا ہے کہ ذکر العیش ہے لطف العیش — عقل کہتی ہے کہ اوس کی آرزو بیکار کی

۱۱ انقلاب دہر جاتا ہے گنواں پانوں کے پاس — آبلوں کو جستجو ہے وادی پر خار کی

۱۲ بخش دیتا ہوں میں اوسکو نیں آنکھوں کا ثواب — طرح ڈالی جس نے یارب جنس کے بازار کی

۱۳ وہ رنگیں مستیاں وہ ولولے جاتے رہے — کیفی اب کیا کہیں طاقت نہیں گفتار کی

کیفی ... بہ تاریخ ۱۵ محرم ... ھ

سرمست کی غزلیات میں مصنف رح کا دستخطی قلمی نمونہ ۱۲

عمر یافعی
جامع کلام کیفی